نکات فکشن

(تحقیقی وتنقیدی مضامین)

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ کے
مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

نکاتِ فکشن

(تحقیقی و تنقیدی مضامین)

محبوب حسن

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

انتساب

اساتذہ کرام کے نام

جن کی روشنی سے میری زندگی کی تاریکی چھٹتی رہی ہے!

فہرست

☆☆

پیش لفظ

''نکات فکشن'' میرے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے ہیں۔ کچھ مضامین سیمینار کی غرض سے تو کچھ ایک کسی خاص کتاب کے لیے لکھے گئے ہیں۔ان میں سے چند مضامین مختلف رسائل میں شائع بھی ہوئے ہیں۔کتابی صورت میں پیش کرنے کے دوران ان میں حسب ضرورت تبدیلی بھی کی گئی ہے۔ان تمام تر مضامین کا تعلق فکشن سے ہے۔در اصل فکشن سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔میرے ایم فل اور پی ایچ ڈی کا موضوع بھی فکشن ہی ہے۔

اس سے قبل ''عصمت چغتائی اور جین آسٹین'' کے عنوان سے میری ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔ایک عام طالب علم کی حیثیت سے میں نے متن کو بنیاد بنا کر مضامین تحریر کیے ہیں۔ ہر چند کہ بعض مضامین کے موضوعات روایتی اور پرانے ہیں تاہم میں نے کچھ نئے پہلو اور نئی جہت دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔آج ہمارے یہاں متن سے لاتعلقی کی شکایت کی جاتی ہے۔فکشن تنقید کے تعلق سے یہ بات بہت حد تک درست بھی ہے۔میں نے اپنے مطالعہ میں متن کو بنیادی اساس بنایا ہے، تا کہ موضوع کے ساتھ انصاف کیا جا سکے۔

کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین کا تعلق ناول سے ہے۔ابتدائی دو مضامین اردو ناول اور تانیثی مسائل سے وابستہ ہیں۔در اصل اردو ناول میں ابتداء سے ہی خواتین کے مسائل زیر بحث رہے ہیں۔اس روایت کی اوّلیت کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کو جاتا ہے۔انھوں نے شعوری طور پر عورتوں کے تعلیمی، معاشرتی اور مذہبی مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اس روایت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔اس طرح روشن خیالی اور حقیقت پسندی کی نئی راہ ہموار ہوئی۔ پریم چند نے بیوہ عورتوں کے حالات و مسائل کو مضبوطی کے ساتھ اٹھایا۔مرد قلم کاروں کے شانہ بہ شانہ خواتین قلم کاروں نے بھی عورتوں کے

سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور مذہبی صورت حال کی سچی ترجمانی کی ہے۔اس ذیل میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، صغری مہدی، جیلانی بانو، ترنم ریاض اور ثروت خان وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ہم عصر ناول نگاروں نے بھی عورتوں کی زندگی کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''مکان'' کی ہیروئن نیرا اور ''اندھیرا پگ'' کی روپی اس امر کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔

''ہم عصر اردو ناول کی کروٹیں'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اس میں اردو ناول کے عصری منظر نامے کی فکری جہات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ شعوری طور پر ۱۹۸۰ء کے بعد منظر عام پر آنے والے ناولوں کو ہی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ان ناولوں کو عہد حاضر کے حالات وکوائف سے جوڑ کر دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔اس مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اردو ناول کی عصری روایت میں اپنے متعلقہ دور سے آنکھ ملانے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔

دراصل عہد حاضر میں اردو ناول کے موضوعات میں بڑی وسعت پیدا ہوئی ہے۔گلوبلائزیشن، کرپشن، فیمنزم، دہشت گردی، انسانی و لسانی حقوق، سیاسی انتشار، لاقانونیت، اخلاقی زوال، بے چہرگی، تہذیبی شکست، اقتصادی بدعنوانی، طبقاتی کشمکش، فرقہ واریت اور بدامنی جیسے نت نئے عصری مسائل نے اردو ناول کو فکر و موضوعات کی نئی منزلوں سے روشناس کرایا۔اردو ناول کی عصری روایت کو جلا بخشنے والوں میں الیاس احمد گدی، قرۃ العین حیدر، جوگیندر پال، حسین الحق، جیلانی بانو، عبدالصمد، شموئل احمد، پیغام آفاقی، یعقوب یاور، مشرف عالم ذوقی، غضنفر، سید محمد اشرف، شمس الرحمٰن فاروقی، ترنم ریاض، ثروت خان وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مضمون ''مکان: ظلم واستحصال کی نئی تعبیر'' بھی ہم عصر اردو ناول سے علاقہ رکھتا ہے۔ ''مکان'' پیغام آفاقی کا مشہور ترین ناول ہے۔یہ ناول شہر کی بے روح زندگی، اخلاقی پستی، لاقانونیت، جنسی پامالی، سماجی و معاشرتی بے راہ روی، سیاسی و اقتصادی بدعنوانی اور ظلم واستحصال وغیرہ کو ایک نئے تیور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پیغام آفاقی نے ناول کی ہیروئن نیرا کے ذریعہ خواتین طبقے کو نئی قوت وتوانائی بخشی ہے۔اس ناول میں پہلی بار کسی تنہا لڑکی کو ظلم واستحصال کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔روایت سے قطع نظر اس ناول میں کرایہ دار کو ظالم اور مکان مالک یعنی سرمایہ دار کو مظلوم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

تقسیم وطن ہندوستانی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔اس حادثے نے انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کی مانند زبان و ادب کو بھی غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔اردو فکشن پر اس المیے کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔اردو ادیبوں اور فن کاروں نے تقسیم کو ایک غیر انسانی اور غیر فطری عمل قرار دیتے ہوئے اس کے جلو میں

رونما ہونے والی بربریت اور ظلم واستحصال کو بے باکانہ طور پیش کیا ہے۔اردو ناول اور افسانے کی ایک لمبی تاریخ اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناول وافسانے کی ایک لمبی تاریخ تقسیم کی نذر ہو گئی ہے اور ایسی صورت میں تقسیم کوئی موضوع نہیں بلکہ دیومالائی کردار کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔

''اردو ناول میں تقسیم کا دیومالائی کردار'' اور''اردو افسانے میں تقسیم کا کرب'' میں تقسیم کے خون آشام واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان دونوں تحریروں میں ہجرت،قتل و خون،اغوا،آبروریزی،فرقہ وارانہ فسادات،ظلم و جبر،تہذیبی شکست و ریخت،اخلاقی زوال،جنسی استحصال،غربت و بدحالی،اقتصادی پستی جیسے حالات ومسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔''اداس نسلیں:ظلم و بربریت کا اعلامیہ'' اور''غدار:فرقہ واریت کی عمدہ مثال'' بھی اسی نوعیت کے مضامین ہیں۔موضوعات کی یکسانیت کے باعث ان تحریروں میں جگہ جگہ تکرار کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔

نازقادری بنیادی طور پر شاعر ہیں۔انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔''وہ ایک بات'' ان کا افسانوی مجموعہ ہے۔انھوں نے حسن وعشق اور سہانی یادوں کے سہارے اپنی تخلیقی کائنات آباد کی ہے۔ان کے افسانے کرشن چندر کی رومانی فضا کی یاد دلاتے ہیں۔ان کے تمام افسانوں میں ایک جیسی کیفیت اور یکساں ماحول ملتا ہے۔مضمون''نازقادری کی افسانوی کائنات'' میں ان کی افسانہ نگاری کے فکروفن سے بحث کرتے ہوئے خوبیوں کے علاوہ چند خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

کتاب میں شامل دو مضامین سفرنامے سے متعلق ہیں۔ پہلا''ظہیر انور کے سفرنامے'' اور دوسرا ''ہندوستان پاکستانی کی نظر سے''۔ظہیر انور جدید اردو ڈرامے کا ایک اہم نام ہے۔انھوں نے دو سفرنامے بھی تخلیق کیے ہیں۔''ایک عرض تمنا'' پاکستان کی رودادِ سفر ہے تو''چراغ رہ گزر'' لندن کی رنگارنگ زندگی کا خوبصورت آئینہ۔پہلی تحریر میں ظہیر انور کے دونوں سفرناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔موضوع کے علاوہ ان کے اسلوب اور زبان وبیان کے حسن وقبح کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

''بھارت میں چار ہفتے'' سید علی اکبر رضوی کا دلچسپ سفرنامہ ہے۔دراصل سفرنامہ نگار پاکستانی شہری ہیں۔وہ تقسیم ہند کے دوران نقل مکانی کر کے پاکستان جا بسے۔ان کی یہ ہجرت اختیاری تھی۔انھوں نے لکھا ہے "I am a Pakistani by option not by compulsion" انھوں نے ایک سیاح کی حیثیت سے ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً دہلی،لکھنؤ،کلکتہ،علی گڑھ،بنارس وغیرہ کا دورہ کیا اور وہاں کی علمی،ادبی،تہذیبی،ثقافتی،جغرافیائی وتاریخی صورت حال کو نہایت عقیدت مندانہ اور والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔مضمون''ہندوستان پاکستانی کی نظر میں'' ان تمام تر عوامل سے ہم کلام ہے۔

استاذ گرامی پروفیسر معین الدین جینا بڑے صاحب میرے لیے شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے میری زبان و بیان کی بہت سی ناہمواریاں دور کیں۔ مجھے کہنے دیجیے کہ انھیں کی تربیت کی روشنی میں راقم الحروف دو جملے لکھنے کے لائق ہوا۔ان کی نگرانی میں میری تخلیقی کاوش کی آبیاری بھی ہوتی رہی ہے۔ان کے حق میں نیک دعائیں!

میں اپنے مشفق استاذ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی صاحب کو خلوص و محبت سے یاد کررہا ہوں جن سے مجھے ہمیشہ ''پرورش لوح وقلم'' کی ترغیب ملتی رہی ہے۔میں بنارس کے معزز اساتذہ پروفیسر نسیم احمد صاحب، ڈاکٹر یعقوب یاور صاحب اور ڈاکٹر مشرف علی صاحب کا تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جن کی رہنمائی وحوصلہ افزائی سے میرے خواب کی تعبیر ہو رہی ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ صاحب، ڈاکٹر خالد اشرف صاحب اور ڈاکٹر مولا بخش صاحب بھی وقتاً فوقتاً میری رہنمائی وحوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ان حضرات نے میری اولین تحقیقی کوشش کو سراہا اور اپنے بیش قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں ان صاحبان علم وادب کی شفقت ومحبت کو سلام کرتا ہوں۔

عزیز بھائی محمد جاوید اور بہن شاہین بیگم کے لیے دعائیں، جن کی نیک تمنائیں میرے مستقبل کو تابناک دیکھنا چاہتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ محمد جاوید کی زندگی میں بھی اردو شامل ہو گئی ہے۔اس کامیابی پر مبارک باد اور نیک تمنائیں! کتاب کی اشاعت میں عزیز دوست رضی شہاب کا ساتھ رہا۔شکریہ!

محبوب حسن

برہم پترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

☆☆

اردو ناول اور تانیثی ڈسکورس

تانیثیت (Feminism) ایک ایسی تحریک اور ایسا نظریہ ہے جس کے ذریعہ سماج کی ستائی ہوئی عورت کی کرب ناک زندگی اور اس کے گونا گوں مسائل کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل اس نظریے کے تحت سماجی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی سطح پر مرد اور عورت کے درمیان حائل فرق کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ اس تحریک کا اصل مقصد عورتوں کے جائز حقوق کی بازیافت ہے۔ یہ تحریک مغربی ممالک کے زیر اثر ہندوستان پہنچی اور بہت جلد ہی یہاں کے مختلف زبان و ادب پر اپنے دیرپا اثرات مرتب کیے۔ آج بھی یہ تحریک سماج کی مظلوم عورتوں کے حقوق اور مساوات کے لیے سرگرم عمل ہے۔

اردو ادب، بالخصوص اردو فکشن میں تانیثی نظریات و تصورات کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ داستانوں سے قطع نظر اردو ناولوں میں عورت کو سماج کے ایک جیتے جاگتے کردار کے طور پر پیش کیا گیا۔ ناول نگاروں نے اس طبقے کو زبوں حالی اور پسماندگی کے گڈھے سے نکالنے کے لیے اس کی زندگی کے تمام تر حالات و مسائل کو موضوع بحث بنایا۔ اردو ناول میں اس کی ایک مستحکم روایت ملتی ہے۔ یوں تو ترقی پسند تحریک کے قبل ہی سے اردو ناول میں عورتوں کے مسائل کی صدائے بازگشت سنائی پڑتی ہے۔ اگر ہم اس ہمہ گیر تحریک کے بعد اردو ناولوں میں تانیثی فکر و عمل کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مرد اور خواتین قلم کاروں کی ایک بڑی جماعت ہے جس نے عورتوں پر ڈھائے گئے ظلم و ستم کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔

ٹھیک یہی زمانہ ہے جب ''انگارے'' (۱۹۳۲) منظر عام پر آتا ہے۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو فکشن میں ایک نیا انقلابی رویہ جنم لیتا ہے۔ ''انگارے'' کے مصنفین نے سماج کے اس دبے کچلے طبقے کے جنسی اور نفسیاتی مسائل سے پردہ اٹھایا اور اس پر تھوپی گئی بے بنیاد مذہبی اور خلاقی پابندیوں کے خلاف بے باکانہ تخلیقی

اظہار کیا۔اردو ناول نگاری بھی ’’ انگارے‘‘ کے اس انقلابی رویے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔بقول صغرا مہدی:

’’انگارے نے تانیثیت کا ایک مضبوط تر نظریہ اردو ادب میں داخل کیا۔اردو ناول نے اس نظریہ کو اپنے رگ و پے میں شامل کر لیا۔دیکھتے ہی دیکھتے یہ طرز فکر اردو ناول نگاری کا ایک ناگزیر حصہّ بن گیا۔عورتوں کے بے شمار مسائل اس میں سانس لینے لگے۔کہیں کہیں یہ سانس للکار کی شکل اختیار کر گئی ہے۔‘‘

(اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت،صغرا مہدی،صفحہ:۷۹) اردو میں ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کی تخلیقات سے ہوتا ہے۔انھوں نے سماج و معاشرے کے جن مسائل پر اپنی خاص توجہ مرکوز کی،ان میں خواتین کے حالات وکوائف کو مرکزیت حاصل ہے۔انھوں نے اس طبقے کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کو بنیادی اہمیت دی۔اگر ہم تانیثی نقطۂ نظر سے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا جائزہ لیں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں تانیثی رجحانات کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔’’مراۃ العروس‘‘’’توبتہ النصوح‘‘’’ابن الوقت‘‘ ’’فسانۂ مبتلا‘‘ وغیرہ اس کے عمدہ نمونے ہیں۔انھوں نے اصغری اور اکبری جیسے مثالی کرداروں کے ذریعہ معاشرے کو روشنی دی۔ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے جائز حقوق کی بازیافت کی اور ان کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک اور سماجی ناہمواریوں کے خلاف آواز اٹھائی۔یعنی کہ اردو ناول نگاری میں تانیثی فکر وشعور کی اوّلیت کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کو جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک سے قبل کے ناول نگاروں میں رتن ناتھ سرشار،عبدالحلیم شرر،علامہ راشد الخیری،مرزا ہادی رسوا،نذر سجاد اور عظیم بیگ چغتائی وغیرہ نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سماج کے اس دبے کچلے طبقے کی زندگی کے تلخ حقائق کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔عورتوں کے سیاسی،سماجی،اقتصادی اور تعلیمی مسائل کو عصری تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ان تخلیق کاروں کے یہاں تانیثیت کا بہت مضبوط رجحان تو نہیں ملتا لیکن عورت اب پردے سے باہر نکل کر اپنا مقام بنانے لگی تھی۔

سرشار نے ’’فسانۂ آزاد‘‘ اور ’’کامنی‘‘ میں تعلیم نسواں اور خواتین کی اذیت ناک زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔عبدالحلیم شرر نے بھی تعلیم نسواں پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔وہ جدید تعلیم کو لڑکیوں کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ان کے یہاں بے جا مذہبی پابندیوں کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ان کے ناولوں میں تعلیم نسواں کا تصور زیادہ ترقی پسندانہ اور پختہ ہے۔ان کے ناول ’’مینا بازار‘‘ اور ’’بدرالنساء کی مصیبت‘‘ وغیرہ میں ان مسائل کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ان کے ایک دوسرے اہم ناول ’’دلچسپ‘‘ میں بیوہ کی شادی کی پرزور حمایت کی گئی

ہے۔

تانیثی فکر کے اعتبار سے علامہ راشدالخیری کا نام نا قابل فراموش ہے۔انھوں نے اپنے بیشتر ناولوں میں خواتین کے معاشرتی،سماجی،تعلیمی،سیاسی،تہذیبی مسائل کی ترجمانی کی ہے۔''صبح زندگی''اور''شام زندگی''جیسے ناول ان کے اس فکری رویے کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد کی طرح انھوں نے بھی خواتین کی تعلیم و تربیت،عزت نفس،خودداری جیسے اخلاقی پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔اپنی انہی خدمات اور کوششوں کے سبب''مصورِغم''اور''لڑکیوں کے سرسید''کہلائے۔ان کے بیشتر کردار اسی فکری دائرے میں سرگرم عمل ہیں۔

اس روایت اور سلسلے کا ایک اہم نام مرزا ہادی رسوا کا ہے۔انھوں نے عورت کی نفسیاتی وذہنی کشمکش کو فن کارانہ انداز میں پیش کی ہے۔''امراؤ جان ادا''ان کا مشہور ترین اور شاہکار ناول ہے۔اس میں ایک طوائف کو بطور مرکزی کردار پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کی ہیروئن سماج کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوکر ایک طوائف بننے پر مجبور ہوتی ہے۔ان کے دوسرے ناول''اکبری بیگم''''اختری بیگم''اور''ذات شریف''میں بھی معاشرے کی ناہمواریوں کو پیش کیا گیا ہے۔مرزا رسوا نے اپنے نسوانی کرداروں کے ذریعہ سماج کے کھوکھلے پن اور بے بنیاد رسم ورواج سے پردہ اٹھایا ہے۔

منشی پریم چند کے ذریعہ اردو ناول نگاری میں ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑی۔انھوں نے اردو ناول نگاری کو نت نئے مسائل سے روشناس کرایا۔انھوں نے کئی اہم ناول تخلیق کیے ہیں۔ان کے ناولوں میں تانیثی فکروشعور کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔انھوں نے عورتوں کی سماجی ناہمواریوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کے ناولوں میں اس طبقے پر ہونے والی ظلم وزیادتی اور غیر انسانی افعال کے خلاف شدید احتجاج ملتا ہے۔

انھوں نے''ستی پرتھا''جیسی منحوس رسم،بیواؤں کی شادی اور خواتین کے دوسرے سنجیدہ ونازک مسائل کو منظرعام پر لانے کی کوشش کی۔''بیوہ''''بازارحسن''''نرملا''''میدان عمل''''گودان''وغیرہ اس کے بیّن ثبوت ہیں۔مذکورہ ناولوں میں عورتوں کے ناگفتہ بہ حالات حقیقی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔انھوں نے خواتین کی بے جوڑ شادی،طلاق،آزادیِ نسواں،طوائف بازاری،جہالت،ذہنی غلامی اور اقتصادی پسماندگی جیسے اہم مسائل کو آئینہ دکھلایا ہے۔ان کے ناول''نرملا''میں سمترا مرد کی بالادستی کے خلاف کہتی ہے:

> ''عورت مرد کے پیروں کی جوتی کے سوا اور ہے ہی کیا؟ مرد چاہے جیسا ہو،چور ہو،ٹھگ ہو،بدکار ہو،شرابی ہو عورت کا فرض ہے کہ اس کے پیر دھو کے پیے۔''

(پریم چند،نرملا،صفحہ:۱۵۲)

دنیائے ادب میں قاضی عبدالغفار اپنے منفرد لب ولہجہ کے باعث مشہور ہیں۔انھوں نے طوائفوں کی تلخ

زندگی کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ان کے ناول ''مجنوں کی ڈائری'' اور ''لیلیٰ کے خطوط'' میں فرسودہ سماج کے جبر وتشدد اور استحصال کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔انھوں نے طوائفوں کی زبان سے سماج کے فرسودہ رسم ورواج اور مرد اساس معاشرے پر اپنے طنز کے نشتر چلائے۔ان سے قبل بھی طوائف اردو ناولوں میں نظر آتی ہے لیکن قاضی عبدالغفار کے یہاں اس کی شخصیت ذرا مختلف ہے۔وہ مثالی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر زندگی کی رمق نظر آتی ہے۔وہ سوچتی اور محسوس کرتی ہے۔اس کے یہاں زندگی کے تئیں ایک واضح نظریہ ملتا ہے۔''لیلیٰ کے خطوط'' میں طوائف لیلیٰ سماج کے پدرانہ نظام اور اپنی ذہنی پسماندگی کو آئینہ دکھاتے ہوئے کہتی ہے:

> ''عورتیں ناقص العقل ہوتیں ہیں۔فطرتاً مرد سے کمتر ہیں۔آج میں بالائے بام پر کھڑی ہوکر پکارتی ہوں، بر سر بازار پکارتی ہوں کہ ہمارے وہ محافظ و نگراں کہاں ہیں، مسجدوں میں ڈھونڈوں یا مندروں میں۔''

(قاضی عبدالغفار، لیلیٰ کے خطوط، صفحہ:۳۲۵)

اردو فکشن میں عصمت چغتائی کا نام محتاج تعارف نہیں۔وہ اپنے تانیثی نظریات وتصورات کے سبب اردو ناول میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ان کے ناول ''ضدی''،''ٹیڑھی لکیر''،''دل کی دنیا''،''معصومہ'' وغیرہ میں عورتوں کی زندگی کے تلخ حقائق کی بازگشت صاف سنائی پڑتی ہے۔انھوں نے اس طبقے کی زندگی خصوصاً جنسی اور نفسیاتی مسائل کو مضبوطی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ان کے یہاں مرد اساس سماج کے جبر وتشدد اور طبقاتی کشمکش کے خلاف صدائے احتجاج ملتی ہے۔

''ضدی'' کی آشا اور ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن سماج کی فرسودہ روایات اور طبقاتی کشمکش کے خلاف ایک مستقل احتجاج کی حیثیت رکھتی ہیں۔آشا سماج کے بے جا رسم ورواج اور ناہمواریوں کے خلاف اپنی جان دیتی ہے تو شمن قدم قدم پر ایسے ماحول سے ٹکراتی ہے۔یہ دونوں معاشرے کے ظلم وستم کا شکار ہوتی ہیں۔عصمت کے یہاں سماج کی درندگی اور بے حسی کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ان کے ناولوں میں تانیثی فکر کی روح سمٹ آئی ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو ناول کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔انھوں نے کئی اہم ناول تخلیق کیے۔ان کے ناولوں کے تانیثی رویّے، دوسرے تخلیق کاروں سے ذرا مختلف ہیں۔انھوں نے عورت کو زماں و مکاں کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ناولوں میں عورت کے استحصال، جلاوطنی، تنہائی، ہجرت اور لاچاری جیسے کوائف سانس لے رہے ہیں۔انھوں نے عورتوں کی مجروح روح اور ان کی جنسی ونفسیاتی کشمکش کو جلاوطنی اور تنہائی کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

''سیتا ہرن'' کی سیتا،''آگ کا دریا'' کی چمپا،''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ،''ہاؤسنگ سوسائٹی'' کی ثریا حسین اور''آخری شب کے ہم سفر'' کی دیپالی سرکار وغیرہ اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔سماج ان نسوانی کرداروں کے جذبات واحساسات نیز ان کے وجود سے کھیلتا ہے۔ممتاز نقاد پروفیسر شمیم حنفی ان ناولوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ان میں عورت کے مقدر، مرد کے ہاتھوں اس کے استحصال، اس کی خود سپردگی، قربانی اور ذہنی جلاوطنی کے تجربے، بہت مؤثر اور حقیقت پسندانہ طور پر سامنے آئے ہیں۔''

(پروفیسر شمیم حنفی، قرۃ العین حیدر،'آواز'،صفحہ:۶)

مذکورہ بالا اقتباس سے قرۃ العین حیدر کے تانیثی تجربے اور فکر وعمل کی نشاندہی ہوتی ہے۔تانیثی فکر کے اعتبار سے خدیجہ مستور کی ادبی خدمات بھی ہماری توجہ کا مرکز ہیں۔ان کے ناول''آنگن''میں عورتوں کے ذہنی کرب، داخلی گھٹن، لاچاری اور بے بسی کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔اس ناول میں انھوں نے تقسیم ہند کے تناظر میں خواتین کو درپیش مسائل کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔نسوانی کردار عالیہ اور چھمی کو معاشرے کی ان ناہمواریوں سے دوچار ہوتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔

جیلانی بانو بھی اپنے بے لاگ تخلیقی اظہار کے لیے جانی جاتی ہیں۔انھوں نے اپنے منفرد ناول''ایوانِ غزل''میں مرد اساس سماج اور مردانہ بالادستی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ان کے یہاں جاگیردارانہ طرزِ معاشرت میں خواتین کی پسماندگی اور بدحالی کی سچّی ترجمانی ملتی ہے۔ان کے دوسرے اہم ناول''بارشِ سنگ''میں بھی عورتوں کی کرب ناک اور شکستہ حال زندگی کی دردناک کہانی بیان کی گئی ہے۔یہ دونوں ناول جیلانی بانو کی جدت پسند تخلیقی رویےّ کو آشکارا کرتے ہیں۔

آج کی عصری زندگی میں بھی یہ طبقہ زبوں حالی اور کسمپرسی سے یکسر آزاد نہیں۔ادیب سماج کا ایک حساس فرد ہوتا ہے۔اس کی یہی فطرت اسے سماجی سروکار سے وابستہ رکھتی ہے۔ہم عصر ناول نگاروں نے بھی عورتوں کی زندگی کے گوناں مسائل کو تانیثی تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔اردو ناول''مکان''(پیغام آفاقی)''دھنک''(عبدالصمد)''بادل''(شفق)''فرات''(حسین الحق)''ندی''(شموئل احمد)''کینچلی''(غضنفر)''مورتی''(ترنم ریاض)اور''اندھیرا پگ''(ثروت خان)وغیرہ اپنے تانیثی شعور کے باعث فکر کی نئی راہیں ہموار کرتے ہیں۔

پیغام آفاقی کا ناول''مکان''تانیثی آگہی کے سبب ایک اہم پڑاؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ناول کی ہیروئن''نیرا''اپنے حرکت وعمل اور جذبات واحساسات کی بنا پر تانیثی فکر وعمل کی مضبوط ترین آواز بن

کرا بھرتی ہے۔اس کی خود کلامی (Dramatic Monologue) تانیثی بغاوت کا اعلامیہ بن گئی ہے۔میرا خیال ہے کہ ''مکان'' کی ''نیرا'' کے بعد ''اندھیرا پگ'' کی ''روپی'' اس روایت کی پاسداری کرتی ہے۔ یہ دونوں نسوانی کردار اپنی تانیثی فکر کی روشنی میں نئی منزل کا پتہ دیتے ہیں۔

اس طرح واضح رہے کہ اردو ناول نگاروں نے ابتدا سے ہی تانیثی ڈسکورس کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ناولوں میں جگہ دی۔مرد فکشن نگار کے شانہ بہ شانہ خواتین ناول نگار بھی اپنے عہد کے مخصوص سماجی، سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور اقتصادی پس منظر میں عورتوں کے گونا گوں مسائل کی عکاسی میں پیش پیش رہی ہیں۔آج کی عصری زندگی مختلف النوع تغیرات سے دوچار ہے۔ نئے نئے سماجی رشتے اور مسائل جنم لے رہے ہیں۔فکروشعور کی نئی نئی راہیں کھل رہی ہیں۔ایسے میں خواتین طبقے کے نت نئے عصری مسائل کو ناول کے کینوس پر پیش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔اس سے غوروفکر کے نئے نئے دریچے وا ہوں گے اور سماج کی ناہمواریاں دور ہوں گی۔

اردو ناول میں تقسیم کا دیو مالائی کردار

ہجرت ازل سے ہی انسان کا مقدر رہی ہے۔دراصل ہجرت اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر کسی نئی سرزمین یا کسی اجنبی دیار میں پناہ لینے کا دوسرا نام ہے۔ہجرت ارادتاً بھی ہوتی ہے اور غیر ارادتاً بھی۔لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کی زیادہ تر ہجرتیں کسی نہ کسی سیاسی جبر یا مجبوری کے تحت ہوئی ہیں۔تقسیم ہند کے بعد ہجرت کی آندھی بھی کچھ ایسے ہی سیاسی جبر کا نتیجہ تھی۔۱۵/اگست ۱۹۴۷ء برصغیر کی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔یہ تاریخ خوشیوں کی سوغات لے کر آئی لیکن کسے پتہ تھا کہ یہ وقتی خوشی آنسو اور غم کے سمندر میں تبدیل ہونے والی ہے۔ہمارا ملک ظالم انگریزوں اور چند مکار اور مفاد پرست سیاسی رہنماؤں کے باعث تقسیم کی لعنت کا شکار ہوگیا۔نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تقسیم کا زخم تازہ ہے۔

یہ محض کسی ایک ملک کا نہیں بلکہ دلوں کا بٹوارا تھا۔جس کے نتیجے میں انسانی رشتے ناطے بکھر گئے۔ماں بیٹے سے جدا ہوئی، بھائی بہن سے جدا ہوا اور بیوی شوہر سے۔''اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا'' کے مصداق لوگوں کے پاس کھونے کے لیے کچھ باقی نہ رہا۔دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں لوگوں کی زندگی جل کر راکھ ہوگئی۔صدیوں پرانی تہذیب اک آن میں مٹ گئی۔مذہبی رواداری اور امن وآشتی کا تصور خاکستر ہوگیا۔لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔انسانیت چیخ اٹھی۔بے گناہ عورتیں اور معصوم بچّے درندگی اور حیوانیت کا شکار ہوئے۔اس قیامت خیز ہنگامے نے انسانی زندگی کو بد سے بدتر بنا دیا تھا۔مذہب اور دوقومی نظریے کی بنیاد پر ہونے والی یہ تقسیم حیوان صفت لوگوں کی ایک سوچی سمجھی چال تھی۔

ہندستان کی دوسری ادبیات کی بہ نسبت اردو زبان وادب میں تقسیم اور اس کے کریہہ مسائل کی صدائے بازگشت شدت سے سنائی پڑتی ہے۔اردو فکشن نگاروں نے براہ راست اس قیامت خیز ہنگامے کو دیکھا اور اس کے مسائل سے دوچار ہوئے۔اس عہد سے وابستہ اکثر وبیشتر قلم کاروں نے تقسیم اور ہجرت کے درد وغم کو بے

با کی اور دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

تقسیم ہند کے مسائل کو موضوع بحث بنانے والوں میں خدیجہ مستور، حیات اللہ انصاری، عبداللہ حسین، کرشن چندر، عبدالصمد، جوگندر پال، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، ظفر پیامی، خالد سہیل، علی امجد، زاہدہ حنا اور الطاف فاطمہ وغیرہ کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان فن کاروں نے تقسیم و ہجرت کے کرب ناک مسائل اور اس عہد کی بے چہرگی و درندگی کو بطور نفسیاتی چیلنج قبول کیا۔ ناول نگاروں نے خارجی مسائل کے پہلو بہ پہلو داخلی کشمکش کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوقومی نظریے کی بنیاد پر کی گئی اس غیر فطری تقسیم نے نہ جانے کیسے کیسے جاں سوز مصائب کو جنم دیا؟ کیسی کیسی صورت حال پیدا کی؟ یہ قیامت سرحد کے دونوں جانب برپا تھی۔ اس غیر فطری فیصلے سے ہر مذہب و ملت کے پیروکار بدحواس و حیرت زدہ تھے۔ اس مخصوص عہد میں تخلیق شدہ ناولوں کے مطالعہ سے تقسیم ہند کے بعد در پیش سماجی، معاشرتی، تہذیبی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی، جنسی اور لسانی مسائل کی سچّی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ناول نگاروں کا حقیقت پسندانہ رویہ سیاسی چال بازیوں اور انسان دشمن عناصر کی بربریت کو پیش کرتا ہے۔ تخلیق کاروں نے ہجرت کے ہر ممکنہ پہلو کو نشان زد کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

دراصل تقسیم کا فوری نتیجہ ہجرت کی شکل میں نمودار ہوا۔ بڑے پیمانے پر ہندو و مسلمان ایک نئی سرزمین اور ایک نئے دیار کی تلاش میں گامزن ہوئے۔ یہ سلسلہ سرحد کے دونوں طرف جاری تھا۔ ہجرت کی ایسی بھیانک مثال انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ اس سانحے نے انسانی سائیکی پر بھی اپنے دیرپا اثرات مرتب کیے۔ اس حادثہ سے بدحواس ہوکر انسان اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا۔ زندگی کی خوشیاں اور آرزوئیں دم توڑتی چلی تھیں۔ تقسیم اور ہجرت کے مسائل و موضوعات پر تخلیق شدہ ناولوں میں ''اداس نسلیں'' ''زمین''، ''آنگن''، ''دوگز زمین''، ''غدّار''، ''بستی'' ''آگے سمندر ہے'' ''تذکرہ'' ''خواب رو''، ''سیتا ہرن''، ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل'' اور ''ٹوٹا ہوا آدمی'' وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو ناول میں ہجرت کے کرب کی نشاندہی کرتے ہوئے پروفیسر انور پاشا نے لکھا ہے:

> ''اردو ناولوں میں لکھنؤ، حیدرآباد، امرتسر اور میرٹھ ابھرنے لگے۔ تقسیم کے نتیجے میں درپیش ہجرت کا کرب اور مہاجروں کی نفسیاتی تموج، شکست خوردگی اور آبادی میں ویرانی کے احساس کی شدت نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے۔ مہاجروں کو وہ سب کچھ نہ مل سکا جنھیں وہ اپنے وطن میں چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ ان کی حویلیاں، ان کے گھروں کے آنگن، اور ان کے گھروں میں چھوڑے ہوئے ساز و سامان کی یاد انھیں عرصے تک ستاتی رہی۔''

(ہندو پاک میں اردو ناول، ڈاکٹر انور پاشا، ص:۱۳۱-۱۳۰)

ناول کے علاوہ اردو افسانوں میں بھی غم سے نڈھال انسان کی چیخ و پکار سنائی پڑتی ہے۔ افسانہ نگاروں نے بھی اس دور کی زندگی کی زہرناکی کو تخلیقی گویائی عطا کی ہے۔ منٹو نے اپنے افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں ایک پاگل کے کردار کے ذریعہ ہجرت کی نفسیاتی کشمکش کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ دراصل یہ افسانہ خود غرض سیاست دانوں کے گال پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ ''کھول دو'' تقسیم اور نقل مکانی کے بھیانک پس منظر کو ایک نئے تیور کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ اس کے علاوہ بیدی کا ''لاجونتی'' قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا'' عبداللہ حسین کا ''جلاوطن'' سید محمد اشرف کا ''ڈار سے بچھڑے'' جیسے افسانے اپنے انداز پیش کش سے ہمیں چونکاتے ہیں۔

''اداس نسلیں'' عبداللہ حسین کا مشہور ترین ناول ہے۔ یہ ناول پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند اور قیام پاکستان تک کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں تقسیم وطن کے زیر اثر پیدا شدہ مسائل مثلاً ہجرت، فرقہ وارانہ فسادات، جنسی تشدد، اخلاقی پامالی، مذہبی و تہذیبی زوال اور اقتصادی پستی جیسے کوائف کو پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دہلی سے ایک قافلہ پاکستان کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ قافلے میں بچے، بوڑھے اور جوان سب شامل ہیں۔ قافلے میں عورتوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ یہ قافلہ راستے بھر حملہ آوروں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتا ہے۔ بے گناہ عورتیں اور معصوم بچے بھی بلوائیوں کی بربریت کا شکار ہوتے ہیں۔ نوجوان عورتوں کو سرِ عام اغوا کر کے ان کی عصمت دری کی جاتی ہے اور انھیں زندہ جلایا جاتا ہے۔ نعیم اس ناول کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ وہ دہلی سے اس قافلے میں شریک ہوتا ہے اور اس پر ٹوٹنے والی قیامت کو خاموشی سے دیکھتا ہے۔ اسی قیامت کا ایک خوفناک منظر ملاحظہ ہو:

> ''نعیم کے سامنے وقفہ وقفہ پر حملے ہو رہے تھے۔ لوگ مر رہے تھے۔ جو مارے جانے سے بچ رہتے، وہ تھک کر گر رہے تھے۔ سامان کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ لوگ خوراک کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کوئی پلیا کے پتھر کے سہارے بیٹھا اور کوئی درخت کے کنارے کھڑا کھڑا مر گیا تھا۔ عورتوں کے ننگے اور مردہ جسم بے شرمی سے پھیلے ہوئے تھے۔ جنگلی جانور اور پرندے ان پر پل رہے تھے۔ جو زندہ تھے مستقل چل رہے تھے اور میاں بیوی بھائی بہن اور ماں بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے۔''

(اداس نسلیں، ص:۸۴۲)

مذکورہ اقتباس کے آئینے میں ظلم و بربریت کا خوف ناک چہرہ نمایاں ہے۔ سوال اس بات کا ہے کہ ان مفاد پرست لیڈروں اور حکام کو اس بھیانک انجام کا احساس کیوں نہیں تھا؟ سوال یہ بھی ہے کہ انسان اتنی درندگی و

حیوانیت پر کیسے اتر آیا؟ عبداللہ حسین نے اس دہشت ناک منظر کی تصویر کشی غضب کی مہارت اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ کی ہے۔ اردو ناول میں ہجرت کی ایسی حقیقی تصویر کہیں اور نظر نہیں آتی۔ انھوں نے حملہ آوروں کی بے حسی اور نفسیاتی کیفیت کی تصویر کشی کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''حملہ ور مار مار کر اس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کے کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش، خوف زدہ کوچ سے ہی محظوظ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ مردہ اور زخمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے، بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گزر جاتا۔''

(اداس نسلیں۔ص:۴۱-۸۴۰)

ناول میں ایک بچہ اپنی ماں سے بھوک کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے ''امی مجھے روزانہ بھوک کیوں لگتی ہے''۔ اس معصوم بچے کا جملہ کس قدر بلیغ اور فکر انگیز ہے؟ ایسے میں عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کی نظم ''روٹی نامہ'' کی یاد شدت سے آتی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ پیٹ کی بھوک انسان سے نہ جانے کیا کیا کرا ڈالتی ہے۔ انسان بے حس وحرکت ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے بھوک کی شدت اور معاشی بدحالی کو ان مہاجرین کے توسط سے کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

''جن کے پاس آٹا نہ تھا وہ بھاری رقمیں دے کر پڑوسیوں سے آٹا خریدنے لگے۔ جن کے پاس پیسے نہ تھے وہ رات کا انتظار کرنے لگے۔ جب اندھیرے میں چوری کی جاسکتی تھی۔ یا گھر کی عورتوں میں سے کسی جوان اور خوش شکل کو تھوڑی دیر کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کر کے.... معاوضے میں اشیاء خوردنی حاصل کی جاسکتی تھیں۔''

(اداس نسلیں، ص:۴۵-۸۴۴)

پیش کیے گئے ان اقتباسات میں ہجرت اور اس کے مصائب کی کتنی حقیقی اور جاندار تصویر ابھرتی ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے عبداللہ حسین کی فکری ونفسیاتی بصیرت اور فنی مہارت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مہاجر قافلے پر گزرنے والی مختلف ذہنی ونفسیاتی کیفیتوں، راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں اور جان مال کے نقصان کو عبداللہ حسین نے اس قدر مہارت اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تمام اردو ادب میں ہجرت کرنے والے قافلوں کی اتنی حقیقی تصویر کہیں اور نہیں ملتی''

(برصغیر میں اردو ناول، ڈاکٹر خالد اشرف، ص:۲۰۷)

ہجرت کے ظلم وستم کو فکشن کے کینوس پر پیش کرنے والوں میں ایک اہم نام کرشن چندر کا بھی ہے۔ان کا ناول ''غدار''، ہجرت کی لعنت و بربریت کو ''اداس نسلیں'' کے طرز پر پیش کرتا ہے۔اس ناول کا کینوس ''اداس نسلیں'' کی مانند وسیع نہیں ہے۔یہ ناول تقسیم ہند کے فوراً بعد رونما ہونے والے حادثات کو پیش کرتا ہے۔دراصل اس ناول میں مہاجروں کے گونا گوں مسائل کو اہمیت حاصل ہے۔اس میں بیج ناتھ، شاداں، سربلند اور پیر قلندر شاہ جیسے کرداروں کے ذریعہ فرقہ پرستی، قتل و غارت، جنسی استحصال اور مذہبی کشمکش کو پوری شدت سے بیان کیا گیا ہے۔

''اداس نسلیں'' کی طرح اس میں بھی سرحدوں کی دونوں جانب ہجرت کا طویل سلسلہ ملتا ہے۔کرشن چندر نے اپنے اس ناول میں انسانوں کے علاوہ بے زبان جانوروں پر ٹوٹنے والی مصیبت کی بھی عکاسی کی ہے۔اس میں رومی نامی ایک کتیا کا کردار ملتا ہے۔یہ کتیا بھی ہجرت کے مصائب کو جھیلتے ہوئے آخر کار راوی ندی میں چھلانگ کر اپنی جان دے دیتی ہے۔رومی کی موت کے بعد بیج ناتھ شدید نفسیاتی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔وہ خود کلامی کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''تجھی کو مرنا تھا رومی؟ تجھی کو میرا ساتھ دینا تھا؟ جب ملک نے ساتھ چھوڑ دیا اور زمین نے اور گلی نے اور خاندان نے اور گھر والوں نے اور دوست احباب نے جب اس دھرتی نے بھی اپنا ساتھ چھوڑ دیا جس کے ساتھ ہزاروں برسوں سے عہد و پیمان باندھ رکھا تھا تو کیا تیری ایسی حقیر کتیا ہی نے میرا ساتھ دینا تھا۔بیوقوف انجان احمق کتیا کس لیے تو نے اپنی جان ختم کر دی۔کس لیے تو نے اس حقیر انسان کے لیے اپنے بچّوں کی قربانی دے دی جو آج اپنے مقصد سے ہٹ چکا ہے اور ظلم وستم کے لہو سے اپنے مستقبل کو داغدار کر رہا ہے۔''

(غدار،ص:۹۰)

اس ناول میں بھی قتل و غارت گری اور انسانی بربریت کا بھیانک منظر نظر آتا ہے۔بیج ناتھ تقسیم وطن کے فوراً بعد لاہور سے ہندوستان ہجرت کرتا ہے۔وہ راستے بھر نفرت، دشمنی، وحشی پن، فرقہ پرستی اور جنسی نراجیت کا ناپاک کھیل دیکھتا ہے۔اس ناول میں بھی غنڈے اور بلوائیوں کی حیوانیت، عورتوں کی آبروریزی، بزرگ اور معصوم بچوں کا قتل وغیرہ سب کی منھ بولتی تصویریں ملتی ہیں۔ایسے ہی ایک خوف ناک منظر کو یاد کرتے ہوئے بیج ناتھ سوچتا ہے:

> ''میری چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں۔بوڑھوں کی لاشیں، جوانوں کی لاشیں، عورتوں کی لاشیں، بچوں کی لاشیں، اوندھی لاشیں، اکڑو لاشیں، لاشیں جن کے دھڑ ننگے تھے،

لاشیں جن کی آنکھیں کھلی تھی، لاشیں جن کی آنکھیں بند تھیں، لاشیں جن کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی، لاشیں جوزندگی کا سارا زہر پی گئی تھیں اوراب ہمیشہ کے لیے سورہی تھیں۔''

(غدار،ص:۱۱۳)

تقسیم اور ہجرت کا یہ عذاب ہندو، مسلم اور سکھ سب پر نازل ہوا تھا۔ سب چیختے چلاتے رہے۔ سب کے سینے بھالے اور بلم سے چھلنی ہوئے۔ سب کے معصوم بچے جاں بحق ہوئے۔ سب بے سروسامانی کے عالم میں بھٹکتے رہے۔ سب نے زمین اور جائداد گوائیں۔ سب کی بہوبیٹیوں کی عزت وعفت لوٹی گئی۔ افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ یہ تقسیم کیوں اور کس کے لیے تھی؟ عورتوں کی بے حرمتی اور بے عزتی کا ایک دل سوز اور دردناک منظر دیکھیے۔ بیج ناتھ نے بھیڑ میں کھڑے ایک شخص سے پوچھا:

''یہاں کیا راشن ملتا ہے؟''

وہ نوجوان ہنس کر بولا۔ ''ہاں یہاں sex (سیکس) کا راشن ملتا ہے۔'''' کیا مطلب''

وہ بولا۔ ''ایک مسلمان لڑکی ہتھے چڑھی ہے۔ ہم لوگ اس کی بے عزتی کررہے ہیں۔''

میں نے سامنے کے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا۔ مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اورآ کے کھڑے ہوگئے۔

''یہ کیو کب تک رہے گا؟'' میں نے اسی نوجوان سے پوچھا۔

''جب تک وہ لڑکی مرنہیں جاتی۔!'' نوجوان نے جواب دیا۔''

(غدار،ص:۸۶-۸۵)

مذکورہ بالا مکالموں کے ایک ایک لفظ سے نفرت، دشمنی، وحشی پن اور جبر وتشدد کی بوآرہی ہے۔ اس ناول میں مہاجروں کی زندگی کی تلخی وکڑواہٹ، مہاجر کیمپ کی افراتفری، بھوک وبےبسی اور ناسازگار حالات وواقعات کی ستم ظریفی کی ایک جیتی جاگتی دنیا آباد ہے۔

خدیجہ مستور اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ ''آنگن'' ان کا اہم ترین ناول ہے۔ یہ ناول ہجرت اور تقسیم کے مسائل ونتائج کو غیر جانب دارانہ طور پر پیش کرتا ہے۔ ان کے دوسرے ناول ''زمین'' میں بھی مہاجرین کے حالات وکوائف کو مرکزیت حاصل ہے۔ ناول ''آنگن'' میں ایک متوسط مسلم گھرانے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس گھر کے بعض افراد مسلم لیگی ہیں تو بعض کٹر کانگریسی۔ بڑے چچا کانگریسی ہیں تو بھتیجی مسلم لیگی۔ کوئی پاکستان اور قائد اعظم زندہ آباد کا نعرہ بلند کرتا ہے تو کوئی گاندھی اور نہرو کی سلامتی کی دعا کرتا ہے۔ گھر میں آئے دن مختلف سیاسی جماعتوں کے جلسے جلوس کا اہتمام ہوتا ہے۔ مصنفہ ایسے ہی ایک جلسے کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتی ہیں:

''گلی میں کانگریسی بچّوں کا جلوس نکل رہا تھا۔ وہ بڑے بے ہنگم طریقے سے شور مچا رہے تھے۔ ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا...... کانگریس زندہ باد، جواہر لعل نہرو زندہ باد، ہندوستان نہیں بٹے گا، جھنڈا اونچا رہے ہمارا......''

(آنگن، ص:۲۱۱)

افسوس کہ ملک کے بٹوارے کا منحوس دن آخر کار آ ہی گیا۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی اس خاندان کے تمام افراد زبردست ذہنی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خدیجہ مستور نے بڑے چچا، عالیہ، چھمی، صفدر، جمیل اور کریمن بوا جیسے کرداروں کے ذریعہ ہجرت اور نقل مکانی کے خارجی و داخلی کشمکش کو نہایت باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عالیہ کی اماں کو پاکستان سے بڑی محبت تھی۔ ایک موقع پر وہ کہتی ہیں ''میں پاکستان نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں۔ پاکستان میں اپنی حکومت ہوگی'' (آنگن، ص:۳۰۵)۔ ناول کی اہم کردار چھمی ایک جگہ کہتی ہے ''مجھے پاکستان کی تھوڑی سی مٹی بھیج دیجیے گا۔ میں اسے مانگ میں لگاؤں گی'' (آنگن، ص:۳۱۳)۔ مصنفہ نے تقسیم کی ایسی صورت حال بھی پیش کی ہے جس میں لوگ ارادتاً اور غیر ارادتاً دونوں حالت میں سرحد پار کرنے پر مجبور ہوئے۔ ناول میں ہجرت کی نفسیاتی و ذہنی گھٹن کو پوری شدت سے پیش کیا گیا ہے۔

ہجرت کے دوران اور ہجرت کے بعد پیش آنے والے مسائل مثلاً مکر وفریب، مفاد پرستی، مذہبی انتشار، تہذیبی زوال، اقتصادی بدحالی، اخلاقی پستی، جنسی بے راہ روی اور جائداد کی باز آباد کاری کی بدعنوانی وغیرہ بہ حسن وخوبی قلمبند کیے گئے ہیں۔ ''اداس نسلیں'' اور ''غدار'' کی مانند اس ناول میں فرقہ وارانہ اور مذہبی تشدد کی ویسی بھیانک تصویر نہیں ملتی۔ اجنبی اور نئے دیار میں مہاجرین مختلف پریشانیوں سے دوچار رہتے ہیں۔ نئی سرزمین پر غیر تو غیر اپنوں نے بھی نظر پھیر لی۔ لوگ بھوک و پیاس کی شدت سے تڑپتے اور مرتے رہے۔

ناول کی ہیروئن عالیہ اپنی ماں کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور جاتی ہے۔ اس کے ماموں نے ایک ہندو کے متروکہ مکان کا تالہ توڑ کر ماں بیٹی کو بسا دیا۔ ایسے مکانات کی جعلی رسیدیں تک فراہم کر دی گئیں۔ ناول میں کہیں کہیں ناسٹلجیا کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ شدید غم اور صدمے کی حالت میں بعض کردار ماضی کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ پاکستان جانے کے بعد لوگوں کو اپنے وطن کی بہتیا دآتی ہے۔ ناول کے کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اس امر کی شہادت فراہم کرتا ہے۔ چند مکالمے ملاحظہ ہوں:

''تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہے ہیں گے؟''۔ بڑی چچی نے پوچھا۔

''واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی، جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔''

''مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں دیں گے، وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ۔''

''ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے، ہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ۔''

(آنگن، ص:۲۹۳)

مذکورہ بالا اقتباسات سے اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ تقسیم اور ہجرت کی آندھی میں لوگوں پر کیا گزری؟ ناول'' زمین'' میں بھی مہاجرین خصوصاً خواتین کے جنسی استحصال ومظالم کی پرسوز کہانی بیان کی گئی ہے۔ہجرت کی آندھی میں ساجدہ اور تاجی جیسی خواتین حیوانیت کا شکار ہوتی ہیں۔ناول میں مہاجر کیمپ کی ہرممکنہ صورت حال کو قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔خدیجہ مستور نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس دل خراش حالات میں عورتیں زیادہ ظلم وستم کا شکار ہوئیں۔یہ ناول نام ونہاد مہذب معاشرے پر سوالیہ نشان ہے۔

عبدالصمد کا ناول''دو گز زمین'' اور ظفر پیامی کا''فرار'' بھی جلاوطنی کی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ان دونوں ہی ناولوں میں جہدآزادی، تقسیم در تقسیم، سقوط ڈھاکہ اور قیام بنگلہ دیش کے تاریخی وسیاسی نشیب وفراز کی حقیقی آئینہ داری ملتی ہے۔''دو گز زمین'' تحریک خلافت سے شروع ہو کر قیام بنگلہ دیش تک کی سیاسی سرگرمیوں کو دیانت داری کے ساتھ پیش کرتا ہے۔اس ناول میں خاص طور پر شرنارتھیوں کے حالات وواقعات اوران کی بے بسی وبے چارگی کا تخلیقی اظہار ملتا ہے۔''دو گز زمین'' کے طرز پر ناول''فرار'' میں بھی تقسیم اور بنگلہ دیش کا تاریخی پس منظر جی اٹھا ہے۔ان دونوں ہی ناولوں میں مہاجروں کی الم ناک زندگی اور ان کے ذہنی کرب و اضطراب کو شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

زیر مطالعہ ناولوں میں فرقہ واریت، بھوک، مفلسی، اخلاقی پستی، تہذیبی زوال، خانہ جنگی، سیاسی جبر اور جائداد کی لوٹ کھسوٹ کے علاوہ مہاجروں اور مقامی باشندوں کی آپسی مخاصمت کو پورے شدومد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔عبدالصمد نے بہار شریف کے ایک مسلم خاندان کے ذریعہ ہجرت کے گوناگوں پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے۔تقسیم کے بعد یہ خاندان بری طرح بکھر جاتا ہے۔گھر کے افراد در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔عدم تحفظ کا احساس ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔سب سے بری حالت تو بہار کے ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ایک بہتر زندگی کی تلاش میں پاکستان گئے تھے۔۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے الگ ہوتے ہی ان کا خواب چکنا چور ہو جاتا ہے۔

حامد اس ناول کا اہم کردار ہے۔وہ زندگی بھر جلاوطنی کا کرب جھیلتا ہے۔قیام بنگلہ دیش کے بعد وہ معاش وسکون کی تلاش میں عرب بھی جاتا ہے۔لیکن وہاں بھی اسے دو وقت کی روٹی کے علاوہ عزت نفس اور آزادی میسر نہ ہوتی۔وہ اپنے ایک خط میں اس بات کا اعتراف بھی کرتا ہے۔وہ خط میں لکھتا ہے''عزت نفس یہاں بھی نہیں

ہے ابّا.....! جس چیز کے لیے ہم لوگ ہندوستان میں مرتے رہے، پاکستان میں ترستے رہے، اس شے کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ کھو کر جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ ہے پیسہ جس سے ہر چیز بازار میں خریدی جا سکتی ہے۔'' (دو گز زمین، ص:۲۶۰)۔ مشرقی پاکستان یعنی ڈھاکہ اور چاٹ گام میں مہاجروں کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتیں۔ کبھی بنگالی اور مکتی واہنی کے لوگ بہاری مہاجروں کو اپنے ظلم و زیادتی کا نشانہ بناتے ہیں تو کبھی انھیں فوج کی بربریت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ بی بی صاحبہ، اصغر حسین اور سرور حسین کی ماں ہیں۔ بٹوارے کے بعد ان کے بیٹے پاکستان چلے جاتے ہیں لیکن بی بی صاحبہ کسی بھی حالت میں اپنی مٹی و سرزمین چھوڑنے کو راضی نہ ہوئیں۔ وہ پاکستان کو جی بھر کوستی رہیں۔ وہ بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہتی ہیں:

> ''پاکستان ......ارے او نامراد، تو میرے بچے کو کھا گیا، میرے خاندان کو برباد کر دیا۔ اب میری بچی کو تو نہ کھا۔ خدا کے لیے یہاں سے واپس چلا جا۔ تجھ پر خدا کی مار۔ میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں پاکستان، اب تو میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں نے تیرا کچھ نہیں بگاڑا۔ آخر تو مجھے کون سی گناہوں کی سزا دے رہا ہے...... پاکستان ......اے پاکستان''

(دو گز زمین، ص:۲۲۵)

اس ناول کا عنوان ہی مہاجر طبقے کے المیے کو پیش کرتا ہے کہ ان مظلوم لوگوں کو زندگی تو درکنار مرنے کے بعد بھی دو گز زمین تک نصیب نہ ہو سکی۔ بقول بہادر شاہ ظفر ''دو گز زمیں مل نہ سکی کوئے یار میں''۔ یہ ناول مہاجرین اور ایسے مظلوم زدہ طبقے کی زندگی کی المناک پہلوؤں کو بے لاگ طریقے سے سامنے لاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جوگندر پال ہم عصر اردو ناول کے اہم ترین ستون ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں فکشن نگار بالواسطہ طور پر ہجرت و جلاوطنی کے حادثے سے دوچار ہوئے۔ ان تینوں قلم کاروں کی جملہ تخلیقات میں جلاوطنی کے خارجی بالخصوص داخلی حالات و مسائل کی چلتی پھرتی دنیا آباد ہے۔ ان فن کاروں کی تخلیقات میں مذہبی و تہذیبی زوال، تاریخی نشیب و فراز، اخلاقی پستی، ذہنی ناآسودگی، بے اطمینانی، بے چہرگی، بے یقینی، احساس شکست خوردگی، ماضی پرستی اور ناسٹلجیا وغیرہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں دوسرے ناول نگاروں کی مانند فرقہ واریت اور مذہبی فسادات کی انتہاپسندی نہیں ملتی بلکہ ایک طرح کا داخلی و نفسیاتی کرب و اضطراب ملتا ہے۔ علاوہ ازیں اپنی سرزمین سے بچھڑنے کا غم، مشترکہ تہذیب و ثقافت کے زوال کا صدمہ، تاریخی انتشار، سماجی ناانصافی، معاشرتی ناہمواری اور ہندو دیومالائی عناصر کو تاریخی و فلسفیانہ طرزِ فکر کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے بیشتر ناولوں میں جلاوطنی کا کرب بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے ناولوں کی مجموعی فضا

جلا وطنی کی کشمکش و انتشار سے تشکیل پاتی ہے۔ناول میں ہر جگہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ناسٹلجیا کا گہرا عکس ملتا ہے۔''میرے بھی صنم خانے'' ''سفینۂ غم دل''''آگ کا دریا''اور''سیتا ہرن''وغیرہ میں نقل مکانی کی شدت واضطراب اور ماضی کی حسین یادوں کی خوبصورت ترجمانی ملتی ہے۔''سیتا ہرن'' کی ہیروئن سیتا میر چندانی تاعمر ہجرت وجلا وطنی کے کرب سے گزرتی ہے۔بقول سیتا میر چندانی ''کیا آپ کو اس کا احساس نہیں کہ یہ میرا دیش ہے۔میرے کھیت۔میرے گاؤں۔میرے پیروں کے مزار۔''(سیتا ہرن،ص:۱۱۹)۔جلا وطنی اور بے سروسامانی کے عالم میں وہ مختلف لوگوں سے تعلقات قائم کرتی ہے۔بے بسی کی حالت میں وہ جنسی استحصال کا شکار بھی ہوتی ہے۔

معروف فکشن نگار انتظار حسین کے ہاں ہجرت کئی معنوں میں ان کی تخلیقی اساس ہے۔جلا وطنی کے نتیجے میں رونما ہونے والے تہذیبی زوال اور ناسٹلجیا نے بنیادی موضوع کا روپ دھارن کرلیا ہے۔ان کے ناولوں میں اپنی جڑوں سے کٹ جانے کا شدید غم و افسوس ہے۔انھوں نے تقسیم ہند،سقوط ڈھاکہ اور ۱۹۷۱ کی ہند و پاک جنگ کی تباہ کاریوں کو ہجرت کے سیاق میں سمجھنے کی سعی کی ہے۔

''بستی''،''تذکرہ''اور''آگے سمندر ہے'' جیسے ناولوں کے واقعات کی تنظیم و ترتیب احساس تنہائی،گھٹن و بے چارگی،تہذیبی زوال،ناسٹلجیا اور انسانی اقدار کی پامالی سے تشکیل پاتی ہے۔یہی تخلیقی حسیت انھیں فکری معنویت عطا کرتی ہے۔ان کی جملہ تخلیقات کی مجموعی فضا ایسے ہی عناصر میں نمو پاتی ہے۔اپنے اہم ناول ''بستی'' میں انھوں نے مہاجروں کی مجروح وشکستہ زندگی اور روح کو ماضی کے دریچوں سے دیکھتے ہیں۔

ناول ''بستی'' میں ہر جگہ بے یقینی اور خوف و دہشت کا ماحول ہے۔جنگ کا خطرہ ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔بھوک و مفلسی بھی سر اٹھائے کھڑی رہتی ہے۔انسان اس قدر مجبور ہو جاتا ہے کہ ''زندگی کی ضرورتیں ہجرت میں مختصر ہوتے ہوتے تن ڈھاکنے اور پیٹ کی آگ بجھانے تک محدود ہو گئی تھیں''(بستی،ص:۸۲)۔ناول کا مرکزی کردار ذاکر جلا وطنی کی ستم ظریفی اور ذہنی خلفشار کا صاف وشفاف آئینہ ہے۔ایک نئی سرزمین اور ایک نئے ملک میں پرسکون اور خوش حال زندگی کا خواب چکنا چور ہوتے ہی وہ ماضی کی خوب صورت اور حسین یادوں کو ہی اپنی زندگی کا اہم سرمایہ تصور کرتا ہے۔ذاکر شدید ذہنی انتشار اور ہنگامے کی حالت میں یادوں کی چادر تان کر سکون محسوس کرتا ہے۔بے اطمینانی کی حالت میں کہتا ہے ''یہ ہماری یادوں کی واپسی کا موسم ہے۔جانے کب کب کی بھولی باتیں یاد آتی ہیں۔اس وقت جب کہ چاروں طرف اتنا ہنگامہ ہے''(بستی،ص:۵۲)۔بقول فراق گورکھپوری ؎

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں

ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

جوگندر پال کا ناول ''خواب رو'' بھی شرنارتھیوں کی زندگی کے المناک پہلوؤں کی سچی ترجمانی کرتا ہے۔ان کا تخلیقی تیور بھی جلاوطنی کی فضا میں نمو پاتا ہے۔وہ بھی انتظار حسین کی طرح اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش کرتے ہیں۔ان کے کردار بھی ناآسودگی اور شدید احساس تنہائی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔موصوف کے یہاں تہذیبی و معاشرتی شناخت ایک مضبوط ترین آواز بن کر ابھرتی ہے۔دراصل اس ناول کا اصل سروکار مختلف قسم کی تہذیبی آمیزش اور ٹکراؤ سے ہے اور اسی امر سے فرقہ واریت کو ہوا ملتی ہے۔

ناول کا اہم کردار اسحاق مرزا مہاجروں کی تہذیبی وفکری دھارے کا نمائندہ ہے۔وہ مشترکہ تہذیب و ثقافت اور اس کی روایت میں ہی انسانی زندگی کی کامیابی و بقا کا خواب دیکھتا ہے۔اس کی رائے میں ''ایک ہی سماج کے لوگ اگر مقامیوں اور غیر مقامیوں میں بٹ کر رہ جائیں تو فرقہ واریت ایک مستقل عذاب کی صورت کھڑی کیے رہتی ہے۔''(خواب رو،ص:۴۳)۔خالد سہیل کا ناول''ٹوٹا ہوا آدمی''الطاف فاطمہ کا ''چلتا مسافر''اور علی امجد کا'' کالی ماٹی''وغیرہ بھی ہجرت کے کرب و اضطراب اور اس کی الم ناک صورت حال کی بہتر ترجمانی کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ تقسیم اور ہجرت کے سانحہ نے اردو فکشن کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔اس عہد سے وابستہ بیشتر فن کاروں نے بٹوارے اور ہجرت کے خوف ناک چہرے کو بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے۔موضوعات کی سطح پر ناول نگاروں نے ہجرت کے ہر ممکنہ گوشے کو اپنی تخلیقات میں سمیٹنے کی شعوری کوشش کی ہے۔خارجی مسائل کے پہلو بہ پہلو داخلی و باطنی کرب واضطراب اور بے اطمینانی و بے چینی بھی ان ناولوں میں رچ بس گئی ہے۔

اردو فکشن میں ہجرت اور اس کی سائکی اس قدر نمایاں ہے کہ اب یہ موضوع نہیں بلکہ ایک دیومالائی کردار کا روپ اختیار کر گیا ہے۔ناول نگاروں نے اس انحطاط پذیر دور کی نفسیات کو موضوعیت اور معروضیت کے ساتھ خلاقانہ طور پر پیش کیا ہے۔ ہندوستان کی دوسری ادبیات کے مقابلے میں اردو ناول نگاروں نے ان کریہہ وزہر ناک مسائل کو زیادہ بہتر طور پر پیش کیا ہے۔شاید اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے تقسیم و جلاوطنی کے عذاب کو خود جھیلا تھا۔

☆☆

خواتین ناول نگار اور تانیثی مسائل

تانیثیت ایک ایسی تھیوری اور ایک ایسی تحریک ہے، جس کے زیر اثر خواتین کی زندگی کے گونا گوں مسائل کو منظر عام پر لانے کی سعی کی جاتی ہے۔اس کا اصل مقصد عورتوں کے حقوق کی بازیافت ہے۔ یہ تحر یک یوروپ سے ہندوستان پہنچی۔آج ہمارے ملک کے مختلف زبان وادب پر اس تحریک یا نظریے کے گہرے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ویسے اردو ادب میں تانیثیت تحریک کی شکل اختیار نہ کر سکی۔اس کے چند اہم وجوہات ہیں۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اس نظریے کو یکسر نظرانداز نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہی طبقہ نسواں کے مسائل شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو زبان وادب میں اپنی جگہ بنانے لگے تھے۔

اردو ادب بالخصوص اردو فکشن پر تانیثیت کا گہرا عکس ملتا ہے۔داستانوں کے برعکس ناول میں عورت کو ایک نئی زندگی ملی۔اسے سماج کے ایک جیتے جاگتے کردار کے بطور پیش کیا گیا۔قلم کاروں نے طبقہ نسواں کی پسماندگی اور زبوں حالی کو موضوع بحث بنایا۔اردو ناول میں اس کی ایک مستحکم روایت ملتی ہے۔مرد ناول نگاروں کے شانہ بہ شانہ خواتین ناول نگاروں نے بھی صنف نازک کے داخلی اور خارجی حالات و کوائف کو اپنے ناولوں میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ادبی تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی یہ بتاتی ہے کہ مرد ناول نگاروں کے یہاں پہلے پہل تانیثیت کے خدو خال ملنے شروع ہوتے ہیں لیکن اردو ناول نگاری کو صحیح معنوں میں تانیثی فکر و شعور سے ہم آہنگ کرنے میں خواتین فکشن نگاروں نے ایک منفرد رول ادا کیا۔''انگارے'' (۱۹۳۲) کے ذریعہ اردو فکشن میں جو چنگاری پیدا ہوئی تھی، اسے شعلہ صفت بنانے میں خواتین فن کاروں کی حصہ داری زیادہ رہی ہے۔

ہر چند کہ ترقی پسند تحریک کے ذریعہ اردو ادب کو ایک نئی روشنی ملی۔فکر و شعور کی انقلابی جہت سامنے

آئی۔تاہم اس اہم موڑ کے قبل سے ہی اردو ناول میں سماجی حقیقت نگاری کے نقوش نمایاں ہونے لگے تھے۔اس عہد میں بھی چند ایسی خواتین ناول نگار نظر آتی ہیں جنھوں نے طبقۂ نسواں کی زندگی کے نازک اور سنجیدہ مسائل کو گویائی عطا کی۔اکبری بیگم،محمدی بیگم،عباسی بیگم،نذر سجاد حیدر،صالحہ عابد حسین اور صغرا ہمایوں بیگم اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

مذکورہ بالا خواتین قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ عورتوں کی زندگی کے کئی تاریک گوشوں کو روشن کیے۔اس عہد کے ناولوں میں مذہب کے پس پردہ طبقہ نسواں پر ڈھائے جا رہے ظلم و زیادتی اور جبر وتشدد کو حقیقت پسندانہ انداز میں بے نقاب کیا گیا۔''گڈری کا لال''(اکبری بیگم)''سرگزشت ہاجرہ''(صغری ہمایوں مرزا)''شریف بیٹی''(محمدی بیگم)اور''آہ مظلومان''(نذر سجاد)جیسے ناولوں میں عورت کے درد والم کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ان ناولوں میں عورت ہر جگہ درد وغم سے نڈھال نظر آتی ہے۔مذکور بالا ناولوں میں بے جا و بے بنیاد مذہبی پابندی،شادی بیاہ،طلاق،جہیز اور پردہ جیسے سنجیدہ مسائل زیر بحث ہیں۔ان ناولوں کے بعض نسوانی کردار جدو جہد،خود اعتمادی اور خود کفالتی کی علامت بن گئے ہیں۔''گڈری کا لال'' کی ہیروئن ثریا کی روشن خیالی پر اظہار خیال کرتے ہوئے صغرا مہدی نے کہا ہے:

> ''ثریا جبیں جو تعلیم یافتہ لڑکی ہے،وہ شادی کے موضوع پر کھل کر بات چیت کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وہ کس قسم کے شوہر کو پسند کرتی ہے۔''

(اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حسیّت،صغری مہدی،ص:۹۵)

ترقی پسند تحریک اردو کی ایک بااثر ادبی تحریک رہی ہے۔اس تحریک کے زیر اثر حقیقت پسندی اور روشن خیالی کا ایک نیا تصور سامنے آیا۔تانیثیت کے چند اہم مسائل بھی اس تحریک کے فکری دھارے میں شامل ہوئے۔اردو ناول میں طبقہ نسواں کی زندگی کے داخلی اور ظاہری حالات و مسائل کا بے باکانہ تخلیقی اظہار ہوا۔عورتوں کے سماجی،سیاسی،اقتصادی،تعلیمی،جنسی اور نفسیاتی صورت حال کی نئی نئی تعبیریں شروع ہوئیں۔مرد اساس سماج کے جبر وتشدد،سماجی ناہمواریوں،قدامت پرستی،طبقاتی کشمکش،توہم پرستی اور فرسودہ روایات پر کھل کر چوٹ کی جانے لگی۔

ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ادبی منظرنامے پر اپنی شناخت قائم کرنے والوں میں عصمت چغتائی،قرۃ العین حیدر،خدیجہ مستور،جمیلہ ہاشمی،بانو قدسیہ،صغریٰ مہدی اور رضیہ فصیح وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ان ناول نگاروں کے یہاں تانیثی شعور زیادہ پختہ نظر آتا ہے۔یہ شعور کہیں کہیں للکار اور چیخ و پکار کا روپ دھارن کر لیا ہے۔

اردو فکشن کی دنیا میں عصمت چغتائی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اپنے تانیثی فکر و نظر اور شدت پسندی کے باعث مشہور ہیں۔ یہ شدت پسندی ان کے ناول اور افسانے دونوں میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے خواتین کے سماجی، سیاسی، تعلیمی، بالخصوص جنسی اور نفسیاتی مسائل شدت پسندی اور گہرائی کے ساتھ پیش کیے۔ ان کی تخلیقی کائنات تانیثی فکر سے آباد ہے۔ افسانہ ''لحاف'' (۱۹۴۲) میں یہ شدت صاف جھلکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان پر مقدمے بھی چلے۔

انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مرد ذات کی بالادستی اور اس کی چیرہ دستیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں Lesbianism شدت اختیار کر گئی ہے۔ ناول ''ٹیڑھی لکیر'' اور افسانہ ''لحاف'' اس کے بیّن ثبوت ہیں۔ ان کے یہاں یہ نازک اور سنجیدہ مسئلہ سماجی ردِ عمل کے طور پر ابھرتا ہے۔ ان کے ناولوں کے بعض نسوانی کردار ایک احتجاج کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن اور ''ضدّی'' کی آشا اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

شمن قدم قدم پر سماجی ناہمواریوں سے ٹکراتی ہے تو آشا طبقاتی کشمکش کے خلاف اپنی جان دے دیتی ہے۔ شمن اپنے حقوق کی پامالی اور مرد کی ناانصافیوں کے خلاف لڑنا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتی ہے۔ دراصل ان نسوانی کرداروں کے عمل پیہم کے پس پردہ مصنفہ کے تانیثی فکر و احساس کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے دوسرے اہم ناول ''معصومہ'' میں بھی یہی فضا ملتی ہے۔ ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن مرد ذات کی زیادتیوں سے تنگ آ کر نہایت غصے میں کہتی ہے:

> ''ہنہ بدتمیز! چور کو چور اور حیوان کو حیوان کہنا بدتمیزی نہیں راست گوئی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے بھوکنے سے میں ڈر جاؤں گی۔ چاہے جو کچھ ہو تمہارے فریب کا حال ضرور لکھوں گی۔ اس طرح دھوکہ دے کر تم بھاگ نہیں سکتے۔ اس کا انجام سوچ لینا۔''

(ٹیڑھی لکیر، عصمت چغتائی، ص:۲۹۱)

ناول ''معصومہ'' کی ہیروئن معصومہ اپنے باپ کی بے توجہی اور بے اعتنائی کی وجہ سے طوائف کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کا یہ قدم مرد اساس معاشرے کے لیے عبرت ناک ہے۔ عصمت نے اس کردار کے ذریعہ سماج کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔ معصومہ کا سودا کرتے وقت اس کی ماں کہتی ہے:

> ''فلیٹ بچّی کے نام ہوگا۔ ایک ہزار کا بندھا خرچ ہے۔ لڑکی بغیر ان کی مرضی سے رات کو باہر نہیں رہے گی۔''

(معصومہ، عصمت چغتائی، ص:۲۲)

مزکورہ بالا اقتباسات سماج اور معاشرے کی تلخ اور کڑوی سچّائیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔عصمت چغتائی کا یہی تانیثی رویہ انھیں دوسرے ناول نگاروں سے الگ کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو ناول کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ان کے بیشتر ناولوں میں عورت کی بے بسی اور لاچاری جھلکتی ہے۔ان کے تانیثی فکر ونظر کے زاویے دوسرے قلم کاروں سے ذرا مختلف ہیں۔انھوں نے طبقہ نسواں کی زبوں حالی کو زمان و مکان کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ناولوں میں عورت کے استحصال،جلاوطنی تنہائی،اور ہجرت جیسے مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔انھوں نے خواتین کی مجروح روح اور ان کی نفسیاتی وجنسی پیچیدگی کو تنہائی وجلاوطنی کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔موضوعاتی سطح پر ان مسائل کے ڈانڈے تانیثی نظریے سے جا ملتے ہیں۔بقول ابوالکلام قاسمی:

> ''قرۃ العین حیدر نے عورت کے مقدر،اس کی مجبوری اور اس کے استحصال کو ترجیحی طور پر اپنا موضوع بنایا۔اس رویّے کو اگر ہم کسی شعوری کوشش کا نام نہ بھی دیں تب بھی اس رویّے کے نتیجے میں سامنے آنے والے اس خام مواد کی قدر وقیمت Feminist Trend کے نقطۂ نظر سے متعین کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔''

(تانیثی ادب کی شناخت اور تعین قدر،ابوالکلام قاسمی،ص:۶۷)

یہ اقتباس مصنفہ کے ناولوں کے تانیثی مزاج کی نشاندہی کرتا ہے۔ان کے ناولوں کی اکثر وبیشتر خواتین زمانے کی ستم ظریفیوں اور چیرہ دستیوں کا شکار ہوتی ہیں۔

''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ،''سیتا ہرن'' کی سیتا میر چندانی،''آگ کا دریا'' کی چمپا،''ہاوسنگ سوسائٹی'' کی ثریا حسین اور''آخری شب کے ہم سفر'' کی دیپالی سرکار وغیرہ اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔یہ تمام کردار کسی نہ کسی صورت میں بے بسی،لاچاری،تنہائی اور احساس محرومی سے دوچار ہیں۔ان میں سے بعض اولاد کی خاطر دکھ سہتی ہیں تو بعض محبوب کی بے وفائی کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔دکھ،درد،افسوس،زبوں حالی،بےبسی اور خود بیگانگی گویا ان کا مقدر ہے۔اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ''ان میں عورت کے مقدر،مرد کے ہاتھوں اس کے استحصال،اس کی خود سپردگی،قربانی اور ذہنی جلاوطنی کے تجربے بہت موثر اور حقیقت پسندانہ طور پر سامنے آئے ہیں۔''

(قرۃ العین حیدر،شمیم حنفی،آواز،ص:۶)

''آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر کا شہرۂ آفاق ناول ہے۔اس ناول کی ہیروئن چمپا خواتین کے دکھ درد،غم ومایوسی اور بےبسی کی علامت بن گئی ہے۔وہ ہر دور میں ایک نئی شناخت اور ایک نئے وجود کے ساتھ نظر آتی

ہے۔لیکن اس کے تئیں زمانے کا رویہ نہیں بدلتا۔اس کی قسمت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔گویا درد وغم اس کے وجود کا ناگزیر حصّہ بن گئے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی ہے۔وہ مذہب اور سماج کی فرسودہ روایات،ذہنی غلامی اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف لڑتی ہے۔بعض اوقات اس کی حرکت وعمل سے شدت پسندی بھی جھلکتی ہے۔رخشندہ کی روشن خیالی سے مرداساس سماج کس قدر حیرت زدہ ہے؟اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ارے ہم دوسروں کو کیا کہیں......اب تو یہ غضب دیکھو کہ خود ہماری مسلمان عورتیں میدان سیاست میں آ رہی ہیں۔پنجاب اور سرحد میں ان لوگوں نے پچھلے دنوں کیا کیا قیامت نہ اٹھائی۔اللہ اکبر۔کیوں قبلہ آپ کی رائے گرامی اس مسئلے میں کیا ہے؟مستورات کا میدان سیاست میں اچھل کود مچانا نہایت درجہ معیوب حرکت ہے نا؟مولانا،مستورات کی گدی میں عقل تو ہوتی نہیں اور ہر چیز میں آج کل اپنی ٹانگ اڑا رہی ہیں۔پھر بعد میں چلائیں گی کہ ہمارے حقوق دو۔''

(میرے بھی صنم خانے،قرۃ العین حیدر،ص:۴۰۲)

اس اقتباس سے عورت کے تئیں مرد ذات کی متعصّبانہ ذہنیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔قرۃ العین حیدر کی تخلیقی کائنات Radical کے بجائے Liberal Feminism کی پاسداری کرتی ہے۔لیکن بعض اوقات ان نسوانی کرداروں کی پیش کش کا انداز مغرب کے Radical Feminism Movement کے رجحان سے میل کھاتا ہے۔

اہم ناول نگار خدیجہ مستور کے ناول''آنگن''اور''زمین''میں بھی صنف نازک کے ذہنی کرب،داخلی گھٹن،بے بسی اور احساس محرومی کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔''آنگن''تقسیم ہند کے تناظر میں سماج کے اس ظالمانہ چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔''آنگن'' کی عالیہ اور چھمی اس نامساعد فضا میں سانس لیتی ہیں۔عالیہ بھی ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن کی طرح ظلم اور استحصال کی آگ میں جھلستی ہے۔دونوں مرد کی بالادستی کو چیلنج کرتی ہیں۔یہی ان کی زندگی کا المیہ ہے۔''زمین''میں خدیجہ مستور نے بیوہ کی کرب ناک زندگی اور جہیز جیسی سماجی لعنت کو نشانہ بنایا ہے۔اس ناول میں ایک مظلوم داشتہ تاجی اپنے مالک کی ہوس کا شکار ہوتی ہے۔آخر کار کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو کر موت سے ہمکنار ہوتی ہے۔

جیلانی بانو کے یہاں بھی مرداساس سماج اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف بے باکانہ تخلیقی اظہار ملتا ہے۔''ایوان غزل''میں جاگیردارانہ طرز معاشرت میں خواتین کی سماجی،سیاسی اور اقتصادی پسماندگی کی

خوبصورت ترجمانی ملتی ہے۔ چانداورغزل اس ناول کے دونسائی کردار ہیں۔ ناول میں دونوں کی زندگی کی غم انگیز اور دردناک کہانی بیان کی گئی ہے۔ چاند مردوں کی ہوس کا شکار ہوکر موت کو گلے لگاتی ہے تو غزل بھی جنسی استحصال کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ دونوں دردوغم اور محرومی و مایوسی کی تصویر بن جاتی ہیں۔ ان کے ایک دوسرے ناول ''بارش سنگ'' میں بھی طبقہ نسواں کی عصمت اورعفت کی پامالی کی الم ناک کہانی ملتی ہے۔

تانیثی مسائل کی پیش کش کے تعلق سے جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ اورصغری مہدی کے نام بھی اہم ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول ''تلاش بہاراں'' میں مذکورہ مسائل کی صدائے بازگشت صاف سنائی پڑتی ہے۔ ناول کی ہیروئن کنول کماری ٹھاکر ایک تغیر پذیر نسوانی کردار ہے۔ اس کی بغاوت اور جدوجہد سماج و معاشرے کے مکروہ چہرے پرایک زوردار طمانچہ ہے۔

''راجہ گدھ'' (بانو قدسیہ)، ''راگ بھوپالی'' (صغری مہدی) اور ''انتظار کا موسم'' (رضیہ فصیح احمد) وغیرہ میں بھی خواتین کی شکستہ حال اور افسوس ناک زندگی کی رنگارنگی ملتی ہے۔ ان ناولوں میں اس معاشرے کی عیاشی، فریب کاری، دغابازی، مکاری اورزیادتی کی حقیقت پسندانہ آئینہ داری کی گئی ہے۔ ان ناولوں کے نسوانی کردار معاشرے کوایک نئی روشنی اورایک نیا رخ دیتے ہیں۔

آج کی عصری زندگی میں بھی طبقہ نسواں مصائب اور دکھ درد سے یکسر آزادنہیں۔ خواتین آج کے اس تغیر پذیر سماج میں پیدہ شدہ نئے نئے مسائل سے گھری ہوئی ہیں۔ ہم عصر خواتین قلم کار عصری زندگی کے پہاڑ کواپنے قلم کے تیشے سے کاٹنے میں مصروف ہیں۔ ترنم ریاض اپنے ناول ''مورتی'' اور ثروت خان ''اندھیرا پگ'' میں تانیثی نظریات وتصورات کی روشنی میں عصری حالات وکوائف سے سروکار رکھتی ہیں۔ ''اندھیرا پگ'' کی ہیروئن روپی، عصمت چغتائی کی شمن اور پیغام آفاقی کی نیرا کی روایت کوجلا بخشتی ہے۔

مختصر یہ کہ ان ناولوں کے نسوانی کردار اپنی تمام تر کوششوں اور جدوجہد سے طبقہ نسواں کی زندگی کے کئی تاریک گوشوں کو منور کرتے ہیں۔ آج کی عصری زندگی نت نئے حالات و مسائل سے دو چار ہے۔ ایسے میں خواتین فکشن نگاروں کو اور زیادہ فعال اورمتحرک رہنے کی ضرورت ہے تا کہ ظلم واستحصال کی آندھی رکے اورایک صحت مند وخوبصورت معاشرہ وجود میں آسکے۔

☆☆

ہم عصر اردو ناول کی کروٹیں

اردو ناول نے ابتدا سے عصر حاضر تک کئی اہم پڑاؤ طے کیے ہیں۔اردو ناول میں کبھی اصلاحی وتبلیغی مقصد حاوی رہا تو کبھی اس نے تاریخی ورومانی فضاؤں میں سانس لی۔اپنی ارتقائی ڈگر پر چلتے ہوئے اس نے کبھی خارجی حالات ومسائل سے آنکھ ملایا تو کبھی داخلی ونفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوا۔وقت کی تبدیلی کے پہلو بہ پہلو اردو ناول میں فکروفن کے نت نئے تجربے ہوتے رہے۔اس ارتقائی سلسلے نے اردو ناول کو نئے نئے افکارو خیالات اور تجربات ومشاہدات سے روشناش کرایا۔آج اردو ناول میں زمانے کے گونا گوں حالات ومسائل سے آنکھ ملانے کی بھر پور صلاحیت موجود ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد کے ہاتھوں لگایا گیا یہ پودا آج ایک تناور درخت کی شکل میں موجود ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ تقسیم ہند کے المیے نے اردو ناول کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے حادثات کی جیتی جاگتی تصویریں اردو ناول میں ملتی ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اردو ناول کی ایک لمبی تاریخ تقسیم وہجرت کی نذر ہوگئی۔ناول نگاروں نے تقسیم کے جلو میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، قتل و غارت گری، اغواوآبروریزی، بے بسی وبے چارگی اور ہجرت کی چیرہ دستیوں کی حقیقی ترجمانی کی۔واضح رہے کہ یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا ہے۔تقسیم کے پیدا کردہ مختلف مسائل اس تحریک کے دائرۂ کار میں شامل رہے۔ان حالات وواقعات کے زیر اثر اردو ناول ایک لمبے عرصے تک خارجی کوائف کی عکاسی کرتا رہا۔یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے تخلیق شدہ ناولوں میں موضوعات کی سطح پر کوئی خاص تنوع نہیں ملتا۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس یہ سلسلہ ذرا تھما۔جدید رجحان کے تحت اردو ناول فکروفن کی نئی فضاؤں میں سانس لینے لگا۔خارجی مسائل سے قطع نظر اردو ناول میں داخلی حسیت بھی سانس لینے لگی۔۱۹۸۰ء تک آتے آتے اردو

ناول ہم عصر زندگی کے نئے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگیا۔اس دور میں قلم کاروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے عہد حاضر کے سماجی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی اور معاشی صورت حال کو اپنی تخلیقی اساس قرار دیا۔گلوبلائزیشن، پولرائزیشن، کرپشن، کارپوریٹ اور کنزیومر کلچر، فیمنزم، دہشت گردی، عالمی جنگ کا خطرہ، ۹/۱۱ کا حادثہ، انسانی و لسانی حقوق، سیاسی انتشار، لاقانونیت، بے چہرگی، تہذیبی شکست و ریخت، اقتصادی زبوں حالی، طبقاتی کشمکش، فرقہ واریت، بد امنی اور دیوالیہ پن وغیرہ سے اردو ناول کے موضوعاتی وفکری امکانات میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔

اردو ناول کے عصری منظر نامے پر اپنی شناخت قائم کرنے والوں میں انور سجاد، عبداللہ حسین، الیاس احمد گدی، قرۃالعین حیدر، انتظار حسین، جوگندر پال، شموئل احمد، عبدالصمد، حسین الحق، جیلانی بانو، پیغام آفاقی، غضنفر، سید محمد اشرف، شمس الرحمٰن فاروقی، مشرف عالم ذوقی، یعقوب یاور، ترنم ریاض اور ثروت خان وغیرہ اہم ہیں۔ان میں بیشتر قلم کاروں نے شعوری طور پر فکروفن کے روایتی بت کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے پیش روفن کاروں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے تخلیقی رویے میں جدت و ندرت پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔اسی سبب سے ان کے فن پاروں میں فکری تنوع اور تازہ کاری کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔زمانی اعتبار سے ۱۹۸۰ء کے بعد منظر عام پر آنے والے ناول ہی میرے مطالعے کا محورومرکز ہیں۔

انور سجاد کا ناول ''خوشیوں کا باغ'' اور انتظار حسین کا ''بستی'' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئے۔''خوشیوں کا باغ'' اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے اعتبار سے بالکل منفرد ناول ہے۔یہ ناول نوتشکیل شدہ پاکستانی معاشرے کا سیاسی انتشار، آمریت پسندی، بے چہرگی اور سماجی اتھل پتھل کو ایک نئے تیور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔تجریدی اور علامتی اسلوب میں ڈھلا یہ ناول سماجی کھوکھلے پن کو اچھوتے انداز میں بے نقاب کرتا ہے۔مصنف نے ہالینڈ کے معروف مصور Hieronymus Bosch کی شاہکار پینٹنگ کی مدد سے اپنی تخلیقی پرواز میں قوت پیدا کی ہے۔یہ ناول عہد حاضر کی آفاقی قدروں کی پاسداری کرتا ہے۔

تقسیم ہند اردو ادب میں Hall Mark کی حیثیت رکھتی ہے۔اس موضوع پر خاصی تعداد میں ناول لکھے گئے۔لیکن ''بستی'' اپنی عصری حسیت کے باعث انفرادیت کا حامل ہے۔اس میں تقسیم در تقسیم اور ہجرت در ہجرت کے تناظر میں انسان کی داخلی ونفسیاتی کشمکش اور فرقہ واریت کو عصری مسائل سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اپنی جڑوں کی تلاش، ماضی پرستی، تہذیبی تصادم، احساس شکست وریخت، ذہنی کرب و اضطراب وغیرہ کو اسطوری، علامتی اور دیو مالائی کردار کے توسط سے پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے سقوط ڈھاکہ اور قیام مشرقی پاکستان

کی سائیکی کی ایک نئی تخلیقی تعبیر پیش کی ہے۔ان دونوں ناولوں میں روح عصر پیوست ہوگئی ہے۔دونوں ناول کسی نئی منزل کا پتا دیتے ہیں۔

بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔اس ناول میں بھی انحراف کی شعوری کوشش جھلکتی ہے۔اس ناول کی تخلیقی اساس علامتی اور استعاراتی فضا میں نمو پاتی ہے۔مصنفہ نے اپنے اس ناول میں ایک مخصوص مذہبی فلسفے اور اخلاقی زوال کو جانوروں کے سہارے پیش کیا ہے۔ان کے فن کا کمال ہے کہ اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کی طرح تبلیغی واصلاحی مقصد حاوی نہیں ہوا ہے۔''راجہ گدھ'' میں انھوں نے معاشرتی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کو خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔اس ناول کے ذریعہ انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ حرام رزق اور مردار خوری سے انسان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ بدکرداری واخلاقی زوال کی جانب مائل ہونے لگتا ہے۔بانو قدسیہ کے اس ناول میں علامہ اقبال کے اس شعر کا عکس صاف جھلکتا ہے ۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کو تاہی

قیوم اس ناول کا ہیرو ہے۔وہ حرام خوری کے باعث مختلف قسم کے نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔آج کے اس دور میں Consumer Culture تیزی سے پنپ رہا ہے اور Corruption عام ہے۔ایسے میں یہ ناول بے حد Relevant ہے۔بلاشبہ بانو قدسیہ نے ایک اہم اور اچھوتے موضوع کو منفرد لب و لہجے میں پیش کر کے اردو فکشن کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔

اردو فکشن میں خدیجہ مستور کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔انھوں نے ''آنگن'' اور ''زمین'' (۱۹۸۳) جیسے اہم ناول تخلیق کیے ہیں۔''آنگن'' جہد آزادی اور تقسیم ہند کے جاں سوز حالات و واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔''زمین'' میں ''آنگن'' کی ہی پر چھائیاں ملتی ہیں۔''آنگن'' میں کانگریس و مسلم لیگ کی چپقلش کے نتائج کا تجزیاتی طریقۂ کار اور ناول کا خوبصورت بیانیہ اسے اعتبار بخشتا ہے۔اس ناول میں ایک ہی گھر کا آنگن مختلف سیاسی جماعتوں کا اکھاڑا بن جاتا ہے۔کوئی کانگریسی ہے تو کوئی کٹر مسلم لیگی۔بڑے چچا کانگریسی ہیں تو بھتیجی مسلم لیگی۔کوئی گاندھی اور نہرو زندہ باد کا نعرہ لگاتا ہے تو کوئی قائد اعظم کی سلامتی کی دعا کرتا ہے۔'آنگن' میں خواتین کو احتجاج و مزاحمت کی قوت بخشی گئی ہے۔اس ناول کی تانیثی معنویت اسے انفرادیت بخشتی ہے۔

ہم عصر ناول نگاروں میں ایک اہم نام جوگندر پال کا بھی ہے۔ان کے یہاں بھی تقسیم اور ہجرت کے

داخلی اور خارجی مسائل نے تخلیقی اساس کی جگہ لی ہے۔اپنی جڑوں کی تلاش، ماضی کے یادگار و حسین لمحات، ناسٹلجیا، تہذیبی شکست و تصادم وغیرہ سے ہی ان کے ناولوں کی فکری آبیاری ہوئی ہے۔''نادید'' (۱۹۸۳) اور''خواب رو'' (۱۹۹۱) جیسے ناول تقسیم و ہجرت کے کرب و اضطراب کو عصری پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ان ناولوں میں اپنی تہذیبی جڑوں اور اپنی مٹی سے الگ ہونے کا غم شدت سے محسوس ہوتا ہے۔

ان کے ناولوں کے ڈانڈے انتظار حسین اور قرۃالعین حیدر کی تخلیقی کائنات سے جا ملتے ہیں۔ان کے یہاں موضوعات کی سطح پر کوئی خاص تنوع نہیں ملتا۔ناسٹلجیا ان کی شناخت بھی ہے اور کمزوری بھی۔البتہ ۲۰۰۴ء میں''پار پرے'' کے نام سے ان کا ایک ناول شائع ہوا۔یہ ناول موضوع کے اعتبار سے قدرے مختلف ہے۔اس ناول کے ذریعہ انھوں نے ایک سنجیدہ مسئلے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ناول'پار پرے'میں جوگندر پال نے پورٹ بلیئر کے سہارے کالے پانی کی سزا و اذیت کو فنی مہارت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔اس ناول میں انگریزوں کی آمریت پسندی، شاطرانہ ذہنیت، ظلم و بربریت اور معصوم و بے گناہ لوگوں کی المناک زندگی کی منھ بولتی تصویریں نظر آتی ہیں۔

خاتون ناول نگار جیلانی بانو اپنے حقیقت پسندانہ طرز اظہار کے لیے جانی جاتی ہیں۔ان کا تخلیقی رویہ جدید اردو ناول کو مزاحمتی و باغیانہ جہت عطا کرتا ہے۔وہ ترقی پسند اور اشتراکی فکر و فلسفہ سے ذہنی مناسبت رکھتی ہیں۔''بارش سنگ'' (۱۹۸۵) ان کا شاہکار ناول ہے۔اس میں انھوں نے حیدرآباد کی جاگیردارانہ تہذیبی زوال، سیاسی جبر، معاشرتی انتشار، طبقاتی تصادم، کسانوں و مزدوروں کے استحصال اور زمینداروں کی چیرہ دستیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔یہ ناول ترقی پسند تحریک کی سطحی خارجیت سے قدرے مختلف ہے۔''بارش سنگ''میں بیانیہ کے روایتی اور جدید اسالیب کا خوبصورت سنگم ملتا ہے۔ناول کا یہی وصف اسے چند اہم عصری ناولوں میں شامل کرتا ہے۔ان کے دوسرے ناول''ایوان غزل''میں بھی ایسی ہی فکری روش ملتی ہے۔

قرۃالعین حیدر نے جدت پسندانہ تخلیقی عمل سے اردو فکشن پر ایک گہرا نقش ثبت کیا ہے۔ان کا شہرۂ آفاق ناول''آگ کا دریا'' گیان پیٹھ انعام یافتہ ہے۔ان کا تخلیقی عمل ایک مخصوص تہذیبی فضا سے تشکیل پاتا ہے۔ان کے یہاں تہذیبی و ثقافتی زوال کی نوحہ خوانی ملتی ہے۔''گردش رنگ چمن'' (۱۹۸۸) ان کا اہم ناول ہے۔یہ ناول مغلیہ عہد سے لے کر عصر حاضر تک کے تہذیبی شکست و ریخت کی داستان بیان کرتا ہے۔دراصل یہ ناول وقت کے ہم راہ بنتے بگڑتے اور ٹوٹتے بکھرتے اقدار حیات کا خوبصورت نگار خانہ ہے۔مصنفہ نے وقت کی

گردش سے وجود میں آنے والے نو دولتیے کی جھوٹی شان اور بے چہرگی کو بے نقاب کیا ہے۔تہذیب وثقافت کی بنتی بگڑتی شکل ہی اس ناول کا اہم موضوع قرار پاتا ہے۔اس ناول میں عصری زندگی بھی ہچکولے کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اردو ناول کے عصری منظرنامے پر عبدالصمد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول ''دوگز زمین'' ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا۔یہ ناول آج کی کھوکھلی اور مادہ پرست زندگی کو ایک نئے ڈھب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔''دوگز زمین'' خلافت تحریک، تقسیم ہند، ۱۹۷۱ء کی جنگ اور قیام بنگلہ دیش کے زیر اثر رونما ہونے والے حالات ومسائل کو عصری تناظر میں پیش کرتا ہے۔اس ناول میں ہجرت اور نقل مکانی کے پس منظر میں سر اٹھانے والی فرقہ واریت، انسانی چیخیں اور سسکیاں وغیرہ سب کچھ ہیں۔

''دوگز زمین'' بہار شریف کے ایک مسلم خاندان کی المناک کہانی بیان کرتا ہے۔یہ خاندان تقسیم در تقسیم اور ہجرت کی انارکی کا شکار ہو جاتا ہے۔اس خاندان کے بعض افراد بہتر زندگی کی تلاش میں ترک وطن کر کے پاکستان، بنگلہ دیش اور عرب ممالک کا سفر کرتے ہیں۔لیکن انھیں کہیں بھی ذہنی اطمینان اور داخلی سکون نصیب نہیں ہوتا۔اپنے وطن کی یاد اور مٹی کی مہک انھیں لاشعوری طور پر پریشان کرتی رہتی ہے۔

بظاہر یہ ناول تقسیم اور ہجرت کے لوازمات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔لیکن عصری حسیت بھی اس ناول میں رچی بسی ہے۔مثلاً آج کی مادہ پرست زندگی، بے اطمینانی، افسردگی، صارفی کلچر اور تہذیبی تصادم وغیرہ اس ناول کے اندرون میں پوشیدہ ہیں۔حامد اس ناول کا اہم کردار ہے۔وہ تقسیم اور ہجرت در ہجرت کا شکار ہوتا ہے۔حامد پاکستان اور بنگلہ دیش سے ہوتا ہوا عرب پہنچتا ہے۔تمام تر آسائشوں کے باوجود وہ ذہنی کرب و اضطراب سے گزرتا ہے۔یہ ناول حامد کے خط کے ساتھ ہی اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔وہ اپنے والد کو خط میں لکھتا ہے:

> ''عزت نفس یہاں نہیں ہے ابّا۔جس چیز کے لیے ہم لوگ ہندوستان میں مرتے رہے، پاکستان میں ترستے رہے، اس شے کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔یہاں سب کچھ کھو کر جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ ہے پیسہ، جس سے ہر چیز بازار میں خریدی جاتی ہے۔بس تین چار برس یہاں اور رہنے کا ارادہ ہے۔اس سے زیادہ کی ہمت نہیں۔ان تین چار برسوں کے بعد جو کچھ ہاتھ لگے گا اس کے سہارے ساری زندگی بسر کرنے کا ارادہ ہے۔''

(دوگز زمین، ص:۲۶۰)

پیغام آفاقی کا مشہور ترین ناول ''مکان'' ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا۔یہ ناول موضوعاتی جکڑ بندی اور فکری

جبر کے خلاف ایک مضبوط ترین آواز ہے۔اس ناول نے ظلم واستحصال کی ایک نئی تعبیر پیش کرتے ہوئے جدید معاشرے کے کھوکھلے پن اور تلخ سماجی حقائق کا پردہ چاک کیا ہے۔ پیغام آفاقی نے خاتون کردار''نیرا'' کے ذریعہ انتظامیہ،عدلیہ اور پولس محکمہ کی بدعنوانیوں اور کرپشن کو ایک نئے تیور اور ایک نئے فکر واحساس کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔اردو ناول میں پہلے پہل ایک تنہا لڑکی کو ظلم واستحصال کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔روایت کے برخلاف یہاں ایک کرایے دار کو بطور ظالم پیش کیا گیا ہے۔

''نیرا''،عصمت چغتائی کی ''شمن'' سے کہیں زیادہ باشعور اور ترقی پذیر کردار ہے۔اس کے ہر ہر قدم سے Feminism کی آہٹ محسوس ہوتی ہے۔ یہ آہٹ Liberal اور Radical Feminism کی آمیزش سے تیار ہوئی ہے۔''نیرا'' عصری تبدیلیوں کو چیلنج کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔وہ ایک لافانی کردار کی حیثیت سے اردو ناول میں مستحکم تانیثی رجحان کا دیا روشن کرتی ہے۔نیرا میڈیکل کی طالبہ ہے۔اس کا کرایے دار کمار اس کے مکان کو ناجائز طریقے سے ہڑپنا چاہتا ہے۔اس کے لیے وہ ہر طرح کے ہتھکنڈے اپناتا ہے۔وہ کمار کے جبر وتشدد اور ظلم واستحصال کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے:

> ''نیرا کی اصل لڑائی کس سے تھی۔اس کی لڑائی دراصل یہ تھی کہ اس کی ایک طرف پردہ در پردہ گھنی زندگی تھی اور دوسری طرف پردہ در پردہ گندھا ہوا کیچڑ تھا اور وہ بیچ میں ایک ایسی چیز پر کھڑی تھی جو کسی بیلٹ کی طرح تھی جو مسلسل کیچڑ میں بڑھ رہا تھا اور وہاں رکے رہنے کے لیے اسے زندگی کی طرف تیز تیز دوڑتے رہنا تھا۔''

(مکان،ص:۸۳)

کسی نظریے وازم سے بالاتر ہو کر پیغام آفاقی نے اردو ناول کے لیے فکر واحساس کے نئے دریچے وا کیے ہیں۔انھوں نے ایک آفاق گیر مسئلے کو اپنی تخلیق کی اساس بنایا ہے۔ یہ ناول یقینی طور پر کسی نئی منزل کا پتا دیتا ہے۔ان کا ایک اور ناول''پلیتہ''(۲۰۱۰) بھی ہماری توجہ کا مرکز بنا ہے۔یہ ناول بھی ایک نئے جہان کا سیر کراتا ہے۔

غضنفر کا تخلیقی سفر تیزی سے رواں دواں ہے۔انھوں نے متعدد اہم ناول لکھے ہیں۔ناول ''پانی''،ان کی جدت پسندی کی عمدہ مثال ہے۔مکان کی طرح یہ ناول بھی روایتی فکر ونظر کے جمود کو توڑتا ہے۔یہ ایک علامتی ناول ہے۔اس ناول کا موضوع قدرتی وسائل پر عالمی اور ظالم طاقتوں کے ذریعہ کیے جانے والا غاصبانہ قبضہ ہے۔

ناول کا مرکزی کردار''بے نظیر''ایک سادہ لوح انسان ہے۔وہ سیاسی سازشوں سے ناواقف ہے۔بے نظیر پیاس سے تڑپتا ہے۔اپنی پیاس بجھانے کے لیے اسے در بدر بھٹکنا پڑتا ہے۔جب وہ ایک تالاب کے پاس

پیش کش:اردو فکشن ڈاٹ کام

پہنچتا ہے تو تالاب کے مگرمچھ اسے پانی پینے سے روکتے ہیں۔تمام تر کوششوں کے باوجود اسے کامیابی نہیں ملتی۔ یہاں پر تالاب کے مگرمچھ کے پس پردہ ظالمانہ قوتوں کی آمریت پسندی اوراجارہ داری کی جانب اشارہ ملتا ہے۔

یہ ناول پانی کوایک بڑے تناظر میں دیکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہاں پانی سے مرادانسانی زندگی کے لیے انتہائی اہم چیز ہے۔اس کی تازہ ترین مثال افغانستان اورعراق پرامریکہ کے ذریعہ کیے گئے حملے ہیں۔ان حملوں کے پیچھے کہیں نہ کہیں قدرتی وسائل (تیل) کے حصول کا مقصد کارفرما ہے۔اس دور کا یہ انتہائی اہم اورسنجیدہ موضوع ہے۔یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ناول ''پانی''عصری زندگی میں بے حد Relevant ہے۔''کینچلی''(۱۹۹۳)''کہانی انکل''(۱۹۹۴)''دوّیہ بانی''(۲۰۰۰)''فسوں''(۲۰۰۳)''وِش منتھن''(۲۰۰۴)اور''شوراب''(۲۰۰۹)غضنفر کے دوسرے اہم ناول ہیں۔ ہر ناول میں نئے تجربات و مشاہدات اور نئےافکاروخیالات کی جھلک ملتی ہے۔

حسین الحق کا ناول ''فرات''۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں کسی خاص ندرت ونئے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ان کا یہ ناول موضوع واسلوب کے اعتبار سے انتظار حسین،قرۃ العین حیدراورعبدالصمد کے تخلیقی دائرۂ کار سے میل کھاتا ہے۔اس ناول میں صوبۂ بہار کے ایک متوسط مسلم گھرانے کی زندگی کوتہذیبی شکست وریخت اورسیاسی انتشار کے پس منظر میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ناول میں سماجی ومعاشرتی بے راہ روی،طبقاتی کشمکش،اخلاقی وتہذیبی زوال،جنسی ونفسیاتی پیچیدگی،نسلی خلیج اورداخلی حالات وکوائف موضوع بحث ہیں۔

ہم عصر اردو ناول میں ایک اہم نام الیاس احمد گدی کا بھی ہے۔ان کا ناول ''فائر ایریا''اردو فکشن کی دنیا میں اعتبار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ناول ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا۔اس کے ساتھ ہی اردو میں ''علاقائی ناول'' کی روایت شروع ہوئی۔اس ناول کا تعلق صوبۂ بہار کے جھریا نامی شہر سے ہے۔اسے چھوٹا ناگپور بھی کہتے ہیں۔ دراصل یہ ناول وہاں کے کولیری مزدوروں کے ظلم واستحصال اوران کی زندگی کے المناک اورتاریک گوشوں کوادبی حسن کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ترقی پسند حقیقت نگاری اورفلسفۂ اشتراکیت سے مماثلت کے باوجود''فائر ایریا'' اردو ناول کے موجودہ منظرنامے پر وسعت کا بھرپور جواز رکھتا ہے۔

سہدیو اور مجمدار اس ناول کے اہم کردار ہیں۔وہ سرمایہ دارانہ جبروتشدد اور چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔اسی جدوجہد میں مجمدار مارا جاتا ہے۔اس کی موت سرمایہ دار طبقے کے خلاف احتجاج اور بغاوت کا استعارہ بن جاتی ہے۔ یہ موت چیخ چیخ کر ظلم واستحصال اورسماجی کھوکھلے پن کو بیان کررہی ہے۔ناول کا فلسفیانہ طرز فکر اسے سطحی خارجیت سے دور رکھتا ہے۔الیاس احمد گدی نے پیٹ اوراس کولیری کی آگ کی خارجی اور باطنی یکسانیت اورافتراقات کا فلسفیانہ جواز فراہم کیا ہے۔انھوں نے ناول میں یہ احساس

بھرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے تمام تر فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کا وجود پیٹ کی آگ میں ہی جھلستا ہے۔انھوں نے بھوک کی فلسفیانہ تعبیر کچھ اس طرح پیش کی ہے:

''بھوک ہزار ہا سال سے یا شاید ازل سے انسان کی سب سے بڑی مجبوری رہی ہے۔یہ بھوک جو آدمی کو غیر انسانی مشقت پر آمادہ کرتی ہے اور غیر انسانی سلوک برداشت کرنے پر مجبور۔''

(فائر ایریا،ص:۸)

شموئل احمد اور سید محمد اشرف کے یہاں بھی انحراف کی خصوصیت نمایاں ہے۔ان کی کوششوں سے اردو ناول فکر و احساس کی نئی منزل اور نئے امکانات سے آشنا ہوا۔شموئل احمد کا ناول ''ندی''(۱۹۹۳) علامتی پیرایۂ اظہار میں مرد عورت کے جنسی رشتے کی جذباتی و نفسیاتی گرہوں کو کھولتا ہے۔اس گھسے پٹے موضوع کو انھوں نے اپنے اسلوب کی ندرت اور فکر کی جدت سے اعتبار بخشا ہے۔انھوں نے غضنفر (پانی) کی طرح ندی کو انسانی زندگی اور عورت کے استعارے کے بطور استعمال کیا ہے۔اس ناول میں ندی و عورت کے درمیان ایک گہرا علامتی ربط پیدا ہو گیا ہے۔

سید محمد اشرف کا ''نمبر دار کا نیلا'' بھی علامتی لب و لہجے کی اچھی مثال ہے۔یہ ناول موجودہ دور کی دہشت گردی، انتہا پسندی، سماجی و معاشرتی بے راہ روی، سیاسی انتشار اور آمریت پسندی کو رمز و ابہام کے ساتھ بے نقاب کرتا ہے۔اس ناول میں نیلا (جانور) کو بطور کردار علامتی روپ دیا گیا ہے۔واضح رہے کہ نیلا جیسا بے ضرر جانور معاشرے کے لیے خطرہ بن کر ابھرتا ہے۔اتنا ہی نہیں برائی کی تربیت دینے والے اپنے مالک کے لیے بھی وبال جان بن جاتا ہے۔

آج کی سیاسی و معاشرتی انارکی کے سیاق میں یہ ناول کسی قدر موضوعاتی وابستگی رکھتا ہے۔اس کا اطلاق امریکہ اور چین جیسے ممالک پر کیا جا سکتا ہے۔یہ طاقتیں پوری دنیا کو دہشت گردی کی آگ میں جھونکنا چاہتی ہیں۔اس کے لیے لوگوں کو باقاعدہ دہشت گردی کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔ان کی ذہن سازی کی جاتی ہے۔تربیت یافتہ ایسے عناصر کبھی کبھی اپنے مالک کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔اس کی مثالیں بھی وقتاً فوقتاً دیکھنے کو ملتی ہیں۔واضح رہے کہ یہ ناول عہد رواں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی اردو ناول کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔نئے نئے افکار و خیالات اور نئی نئی تکنیک کے دوش پر اردو ناول کا سفر خوش اسلوبی سے جاری ہے۔مشرف عالم ذوقی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ان کا تخلیقی ذہن عصری زندگی کے لوازمات کا پروردہ ہے۔وہ ہم عصر زندگی کے مسائل سے

پہلوتہی نہیں کرتے بلکہ انھیں اپنے فن کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ان کا ادبی سفر تابنا کی کے ساتھ جاری ہے۔ان کے اہم ناولوں میں ''بیان''،''نیلام گھر''،''شہر چپ ہے''،''پروفیسر ایس کی عجب داستان''،''پو کے مان کی دنیا'' اور ''لے سانس بھی آہستہ'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''بیان''، تقسیم ہند کے بعد ملک کے طول وعرض میں پنپنے والی فرقہ واریت کے خوف ناک چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ ناول ممبئی کے فرقہ وارانہ فسادات ونسل کشی اور بابری مسجد کی شہادت کے المیے کے پس منظر میں مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی زندگی کو جرأت مندی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔''نیلام گھر'' انتظامیہ اور پولس ڈپارٹمنٹ کی بدعنوانی وبے راہ روی اور افسر شاہی کے کھوکھلے پن کو بے باکی سے سامنے لاتا ہے۔''پو کے مان کی دنیا'' عصری تہذیب اور نئی نسل کی افسوس ناک تصویریں پیش کرتا ہے۔اس ناول میں Globlization اور Consumer Culter کے مہلک اور خطرناک اثرات سے آگاہی ملتی ہے۔ان کے حالیہ ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' (۲۰۱۱) میں بھی عصری حسیت کارفرما ہے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں منظر عام پر آنے والے اہم ناولوں میں احمد صغیر کا ''جنگ جاری ہے'' (۲۰۰۲) شفق کا ''بادل'' (۲۰۰۲) ترنم ریاض کا ''مورتی'' اور ''برف آشنا پرندے'' (۲۰۰۹) ثروت خان کا ''اندھیرا پگ'' (۲۰۰۵) احمد صغیر کا ''دروازہ ابھی بند ہے'' (۲۰۰۸) اور یعقوب یاور کا ''جہاد'' (۲۰۰۹) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا ناولوں میں بھی زندگی کے نئے نئے سماجی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی سروکار پورے شدومد کے ساتھ ملتے ہیں۔

۱۹۸۰ء کے بعد تخلیق شدہ ناولوں کے جائزے سے یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ اردو ناول کا مستقبل اب زیادہ خوش آئند اور تابناک ہے۔اردو ناول میں عصری حالات ومسائل سے چشم پوشی نہیں ملتی بلکہ اس کے اندر وقت اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی قوت پیدا ہوگئی ہے۔اردو ناول کے عصری سرمایے میں عہد حاضر کی زندگی کی رنگارنگی پورے آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ہم عصر اردو ناول میں موضوع اور تکنیک کی سطح پر کسی نئی آہٹ اور نئی منزل کا سراغ ملتا ہے۔

مکان: ظلم واستحصال کی نئی تعبیر

ناول فکشن کا اٹوٹ حصّہ ہے۔اسے بجا طور پر عہد جدید کا رزمیہ کہا جا تا ہے۔ یہ صنف ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے کو اپنے اندر سمیٹنے کی بھر پور صلاحیت رکھتی ہے۔اردو ناول نگاری سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔عہد حاضر میں انسانی زندگی گونا گوں مسائل سے دو چار ہے۔اس کے سبب اردو ناول کے موضوعات میں بڑی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ہم عصر فکشن نگاروں نے اپنے پیش روقلم کاروں سے قطع نظر فکر وموضوعات کی نئی فضاؤں میں سانس لینے کی شعوری کوشش کی ہے۔

ہم عصر اردو ناول کے تانے بانے گلوبلائزیشن، پولرائزیشن، کرپشن، کارپوریٹ اور کنزیومر کلچر، فیمنزم،دہشت گردی، عالمی جنگ کا خطرہ،۹/۱۱ کا حادثہ، انسانی ولسانی حقوق،سیاسی انتشار،لاقانونیت،جبر وتشدد،جنسی استحصال، بے چہرگی،تہذیبی شکست و ریخت،اقتصادی زبوں حالی،طبقاتی کشمکش،فرقہ واریت،بد امنی، اخلاقی زوال اور دیوالیہ پن جیسے موضوعات و مسائل سے تیار کیے گئے ہیں۔عصری زندگی کے سماجی،معاشرتی، سیاسی،اقتصادی،تہذیبی اور تعلیمی سروکار نے اردو ناول کو تجربات ومشاہدات اور فکر وآگہی کی نئی بلندیوں سے روشناس کرایا ہے۔

اردو ناول کے عصری منظرنامے پر جن ناول نگاروں نے منفرد شناخت قائم کی ہے ان میں ایک اہم نام پیغام آفاقی کا ہے۔ان کا مشہور زمانہ ناول ''مکان'' ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول موضوعاتی جکڑ بندی اور فکری جبر کے خلاف مضبوط ترین آواز ہے۔اس ناول نے ظلم واستحصال کی ایک نئی تعبیر پیش کرتے ہوئے جدید شہری معاشرے کے کھوکھلے پن اور تلخ سماجی حقائق کا پردہ چاک کیا ہے۔ناول نگار نے ایک خاتون کردار ''نیرا''

کے پس پردہ عدلیہ، انتظامیہ اور معاشرے کی بدعنوانیوں کو ایک نئے تیور اور ایک نئے فکر و احساس کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ اردو ناول میں پہلے پہل کسی تنہا لڑکی کو ظلم و استحصال اور زمانے کی ستم ظریفی کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ مسائل کی پیش کش کے طریقۂ کار نے ہی ''مکان'' کو ہم عصر اردو ناول میں انفرادیت و معنویت کی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ اسے ہم عہد حاضر کی پر پیچ زندگی کا اعلامیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اردو ناول میں ظلم و استحصال کوئی نیا موضوع نہیں۔ اس موضوع پر خاصی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ قلم کار کی پیش کش کا رویہ کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی خاص مقصد و نظریے کے تحت کوئی ناول لکھا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے مفکرین و نظریہ ساز نقادوں نے سماج کو دو طبقے میں تقسیم کیا۔ اس تحریک کے اشتراکی نظریے کی بنیاد پر سرمایہ دار طبقے کو ظالم اور پسماندہ و غریب طبقے کو مظلوم قرار دیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کی تخلیقی عمارت اسی اساس پر ٹکی ہوئی ہے۔ منشی پریم چند کا ''گئودان'' اس کی بہترین مثال ہے۔ پیغام آفاقی نے اپنے ناول ''مکان'' کے ذریعہ اس روایتی بت کو توڑنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس ناول میں پہلی بار ایک سرمایہ دار یعنی مکان مالک کو بطور مظلوم اور کرایہ دار کو ظالم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ وقت و حالات کی تبدیلی اور جدید نظام زندگی کے بدلتے ہوئے پیمانے کا نتیجہ ہے۔

پیغام آفاقی نے شہر کی بے روح زندگی، سماجی بے راہ روی، اخلاقی زوال، اقتصادی بدعنوانی، جنسی پامالی، ظلم و استحصال اور سیاسی جبر وغیرہ کو خوبصورتی سے اپنے تخلیقی سانچے میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے موضوع کی مناسبت سے کرداروں کو خلق کیا ہے۔ ان کرداروں کی حرکت و عمل سے ناول میں جان سی پڑ گئی ہے۔ ناول کی ہیروئن ''نیرا'' میڈکل کی ذہین طالبہ ہے۔ وہ اپنی بوڑھی و بیمار ماں کے ساتھ اپنے ذاتی مکان میں رہتی ہے۔ کمار نامی شخص اس کا کرایہ دار ہے۔ وہ ''نیرا'' کے مکان کو ناجائز طریقے سے ہڑپنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ ناول کے دوسرے اہم کرداروں میں اشوک، الوک اور نیّر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اشوک شہر کا ایک پراپرٹی ڈیلر ہے۔ وہ ایک بداخلاق اور مادہ پرست انسان ہے۔ جرائم پیشگی، مادہ پرستی اور صارفیت اس کے خون میں شامل ہے۔ اس کے نزدیک اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ نیرا کے مکان پر ناجائز قبضہ کرنے کے لیے کمار کو ہر طرح کے وسائل فراہم کرتا ہے۔ الوک شہر کا ایک اسسٹنٹ کمشنر آف پولیس ہے۔ وہ نیرا کی سہیلی سرلا کا ماموزاد بھائی ہے۔ الوک سے نیرا کی ملاقات اس کی سہیلی سرلا کے توسط سے ہوتی ہے۔ وہ ایک نیک دل اور اخلاق مند کردار کے بطور ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن جلد ہی معاشرے کی بے راہ روی اور بدعنوانی اسے اپنا شکار بنا لیتی ہے۔ شراب اور شباب کی بری لت میں پڑ کر الوک جیسا فرشتہ صفت انسان بھی زندگی کے عظیم مقاصد سے بھٹک جاتا ہے۔ پیغام آفاقی نے ان کرداروں کی بنیاد پر اپنے ناول کی عمارت

کھڑی کی ہے۔

بظاہر اس ناول کا موضوع ایک مکان ہے۔لیکن اس مکان کے پس پردہ شہر کی بے روح زندگی،ٹوٹتی بکھرتی انسانی واخلاقی قدریں اورظلم واستحصال کی ایک جیتی جاگتی دنیا آباد ہے۔ناول کا ابتدائی جملہ ''یہ ایک سنگین مسئلہ تھا۔نیرا کا مکان خطرے میں تھا۔'' قاری کے ذہن میں تجسس پیدا کرتا ہے۔نیرا نامی ایک تنہا لڑکی کو اپنا مکان بچانے کے لیے پرخطر راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکان نہیں بلکہ اس کے وجود کا اہم حصہ ہے۔وہ قدم قدم پر خطرناک اوراندھی قوتوں سے ٹکراتی ہے۔اشوک اورالوک جیسے طاقت ور لوگ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود نیرا کے سامنے مجبور ثابت ہوتے ہیں۔دراصل نیرا کی جیت حیات وکائنات کی جیت ہے۔اس فتح سے نیرا کی زندگی کی نہ جانے کتنی خوشیاں اور کیسے کیسے حسین خواب وابستہ تھے؟ نیرا ،کمار کی حرکتوں سے اس کی گندی نیت کو جلد ہی بھانپ لیتی ہے۔اس کے دل کی آہٹ ملاحظہ ہو:

> ''جب اسے یہ محسوس ہوا کہ کمار اپنی دولت کی ان دیکھی قوتوں کا سہارا لے کر اس کے پورے مکان کو ہڑپ لینا چاہتا ہے تو وہ گھبرا گئی۔پھر جب اس نے کمار کے قدموں کو روکنے کی کوشش کی اور لوگوں کے پاس مدد کے لیے گئی تو دیکھا کہ تمام لوگوں کے چہرے اور تمام چیزوں کے رنگ بدلنے لگے تھے۔اسے اپنے سامنے کی حقیقت پر خواب کا سا گمان ہوا اور اسے لگا کہ اس کے مکان کی چھت اب آسمان تک اٹھ گئی تھی۔اور اس کی دیواریں افق تک بھاگ گئی تھیں۔''

(مکان، پیغام آفاقی،ص:۶۵)

مذکورہ اقتباس کے آئینے میں زمانے کی بے حسی وستم ظریفی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس ناول میں ظلم و استحصال کی کئی شکلیں اوراس کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔نیرا کا مکان دراصل اس کا ضمیر ہے۔مکان کا تعلق براہ راست اس کی زندگی اوراس کے وجود سے ہے۔وہ کسی بھی قیمت پر مکان کو کھونا نہیں چاہتی۔افسوس کا مقام ہے کہ کس طرح سے پورا زمانہ اس کے خلاف ہوجاتا ہے۔پیغام آفاقی نے اپنے اس ناول کے ذریعہ نام نہاد مہذب معاشرے کو آئینہ دکھلایا ہے۔نیرا جب اپنے مکان کی حفاظت کو چیلنج کے طور پر لیتی ہے تو اس کی آواز کو دبانے کی ہر ممکن سعی کی جاتی ہے۔کبھی اسے جان سے مارنے اوراغوا کی دھمکی دی جاتی ہے تو کبھی انتظامیہ وعدلیہ کا خوف دکھا کر اس کے بڑھتے قدم کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس جدوجہد اور کشمکش میں سارا معاشرہ ننگا نظر آتا ہے۔

پیغام آفاقی کے اس ناول سے جدید زندگی کی زوال پذیر اخلاقی قدریں، بے چہرگی، لاقانونیت،انتشار،بدامنی اورخوف وغیرہ مترشح ہیں۔کمار اوراشوک کی ہزار دھمکیوں کے باوجود نیرا کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔وہ زمانے کی ستم ظریفی اورناانصافی کے خلاف لڑنا اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دیتی ہے۔کمار،اشوک

کی مدد سے نیرا کے مضبوط ارادے وحوصلے کو کچلنا چاہتا ہے۔لیکن نیرا معاشرے و زمانے کی تمام تر اندھی قوتوں کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہے۔حق و باطل کی اس جنگ میں کمار اور اشوک جیسے لوگ اپنی طاقت کے باوجود بونے ثابت ہوتے ہیں۔ ناکامی کے احساس سے وہ انتہائی حد تک خوف زدہ ہوتے ہیں۔اشوک کمار کو مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

"دیکھو کمار...... یہ لڑکی تو ایسے ماننے گی نہیں۔تم کو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ کچہری وچہری سے وہ نہیں دبے گی۔اس قسم کے لوگوں کا ایک ہی علاج ہے۔سیدھی بات یہ کہ اب ایک بار جم کر کچھ ہو جائے اور اس کو اس کی اوقات کا احساس کرا دیا جائے ورنہ یہ سالی چھوکری بہت اچھل کود کرے گی۔کچھ آدمی بلاؤ اور اس کا وہ کمرا جس میں وہ رہتی ہے اس کو بھی خالی کرا کے اس کی چھٹی کرو، پہلے تو اس سے مار پیٹ کروا دو سڑک پر، پھر تھانے جائے گی۔وہاں اس کی رپورٹ نہیں درج ہونی چاہیے، چاہے اس کے لیے جو کرنا پڑے......اس کے بعد دوبارہ پھر پٹائی کراؤ، اگر نہیں بھاگتی ہے تو پھر پٹائی کراؤ، ضرورت پڑے تو اس کو بند کراؤ، اپنے بھی کچھ آدمی بند ہونے دو،......نہیں مانتی تو سالی کو اٹھوا لو......اور اس کے ساتھ بلیو فلم بنوا لو اور ......اسٹامپ کاغذ پر دستخط کروا لو...... یہ سب اتنا زیادہ کرو کہ یہاں رہنے کے بجائے وہ اپنے گھر تالا لگا کر چلی جائے۔

(ایضاً،ص:۲۸۷)

ادیب معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔وہ اپنے عہد کی تلخی وکڑواہٹ کو اپنے فن پارے میں پیش کرتا ہے۔اس کی تخلیقات میں سماج ومعاشرے کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں پڑھی جا سکتی ہیں۔منٹو نے اپنے زمانے کی اسی تلخی کو عورت کی گھائل روح کی شکل میں پیش کیا۔ ہزار لعن طعن کے باوجود وہ ایک حساس اور بے باک قلم کار کے بطور اس بات پر اڑا رہا کہ اس کی تحریروں میں پائی جانے والی برائیاں دراصل معاشرے کی بے راہ روی وبدعنوانی کی پرچھائیاں ہیں۔یہی خوبی فن کار کو زندہ رکھتی ہے۔

پیغام آفاقی نے بھی ایک بے سہارا اور بے دست و پا لڑکی کی گھائل روح کو گویائی عطا کی ہے۔یہ ناول عصری اور شہری جدید زندگی کی پیچیدگی اور سفاک حقیقت کو آشکارا کرتا ہے۔ناول کے مسائل اور کردار کی پیش کش کے پس پردہ ناول نگار کا کوئی خاص نقطۂ نظر کارفرما ہے۔ بلاشبہ اس ناول میں جبر وتشدد کی عکاسی کی گئی ہے۔لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ ناول کی قرأت ہمیں بتاتی ہے کہ روایت سے قطع نظر یہاں نیرا نامی ایک نسوانی کردار طبقۂ نسواں کا نمائندہ بن کر ابھرتا ہے۔اس کا نسائی وتانیثی رویّہ مرد اساس

معاشرے کے خلاف احتجاج ومزاحمت کی علامت بن گیا ہے۔

اس سیاق میں ایک سوال قائم ہوتا ہے کہ پیغام آفاقی نے ایک تنہا لڑکی کو اس قدر مجبور ولا چار بنا کر کیوں پیش کیا ہے؟ درحقیقت وہ سماج کے ظلم واستحصال اور چیرہ دستیوں کی شدت کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نیرا کے ذریعہ خواتین طبقے کو ضمیر وخودی کی بیداری، ذہنی آزادی، قوت وآگہی اور اپنے حقوق کی بازیافت کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ پیغام آفاقی کی نیرا کسی داستان یا مثنوی کی ہیروئن نہیں ہے جو ناسازگار حالات میں آنسو بہائے۔

دراصل نیرا عصری حالات ومسائل کی پروردہ ایک ایسی خاتون ہے جو ہواؤں کا رخ موڑنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس کے اندر زمانے کے سرد وگرم اور نشیب وفراز سے آنکھ ملانے کا حوصلہ وقوت ہے۔ وہ کسی صورت میں زندگی سے فرار نہیں چاہتی۔ وہ ''ٹیڑھی لکیر'' کی ہیروئن سے کہیں زیادہ باشعور وترقی پذیر کردار ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیرا وقت اور حالات کی بدلتی ہوئی آواز ہے۔ یہ آواز ہمیں دعوت فکر کے علاوہ دعوت عمل بھی دیتی ہے۔

پیغام آفاقی نے شہری معاشرے کی چیرہ دستیوں، حاکم طبقے کی شاطرانہ حرکتوں، عدلیہ وانتظامیہ کی بدنظمی وغیرہ کی کئی پرتیں کھولی ہیں۔ اس ناول کی ہیروئن کی بے بسی ولا چاری میں درحقیقت انسانی معاشرے کی بے بسی و لا چاری جھلکتی ہے۔ انھوں نے اس ناول میں شہر کی گھناؤنی زندگی پر کڑی تنقید کی ہے، جہاں انسانی سماج کئی طبقے میں بٹا ہوتا ہے، جہاں کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہوتا۔ یہ ناول وہاں کی بظاہر خوشنما اور پرکشش زندگی کی تہہ میں پوشیدہ گھٹن، مفاد پرستی، مایوسی، تنہائی، بے بسی، مکروفریب اور کراہیت وغیرہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے برعکس گاؤں کی زندگی آج بھی اطمینان بخش اور پرسکون ہے۔ وہاں انسانی ہمدردی، بھائی چارگی اور امن وآشتی کا دیا روشن ہے۔

''مکان'' کے کرداران تمام تر سچائیوں اور تلخ حقائق کو روشن کرتے ہیں۔ جب کمار مکان کے لالچ میں نیرا کو زدوکوب کرنا شروع کرتا ہے تو وہ انصاف کی غرض سے عدلیہ وانتظامیہ کا رخ کرتی ہے۔ ایسے میں کچھ لوگ اس کی مدد کی خاطر ضرور سامنے آتے ہیں۔ نیرا کئی لوگوں سے فریاد بھی کرتی ہے۔ لیکن کمار اور اشوک جیسے لوگوں کے اثر اور دبدبے کے آگے سب کے سب مجبور اور لاچار ثابت ہوتے ہیں۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ اس کے پڑوسی بھی اس کی مدد کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کمار واشوک کے دباؤ وبہکاوے میں آکر نیرا پر بدچلنی کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''اب یہ گھر کوٹھا بن گیا ہے۔ کیا بہترین صوفہ سیٹ ہے۔ اور پورا کمرا کتنے قرینے سے سجا ہوا

ہے۔تم پریشان ضرور ہولیکن اس پریشانی سے نکلنے کا بھی خوب طریقہ ڈھونڈا ہے۔ پریشان لوگ اپنے محلے کے لوگوں سے اپنا دکھ بیان کرتے ہیں۔اس طرح کی لاپرواہی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ہمیں بے وقوف سمجھ رہی ہو؟ یہ ضرور تمہارا گھر ہے لیکن محلے سے باہر تو نہیں ہے۔ یہ مکان بھی تو اسی محلے کا ایک حصہ ہے اور تم بھی محلے کا ایک حصہ ہو۔ یہاں رہنا ہے تو ٹھیک سے رہو۔''

(ایضاً،ص:۱۲۱)

لفظ''کوٹھا'' سنتے ہی نیرا کے پاؤں سے زمین کھسک جاتی ہے۔اس کا پورا وجود کانپ جاتا ہے۔حیرت وافسوس کی بات یہ کہ سب کچھ انسپکٹر نیّر کی موجودگی میں ہوتا ہے۔جدوجہد کی اس راہ میں اس کی ملاقات کئی طرح کے لوگوں سے ہوتی رہی۔انسانی شکل میں کئی ایسے بھیڑیے بھی ملے جنھوں نے مدد دینے کے بدلے میں اسے بستروں پر مدعو کیا۔نیرا نے اپنے مضبوط ارادوں اور بیدار ضمیر کی بنا پر خود کو جنسی استحصال سے محفوظ رکھا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ایسے کسی بھی ظلم وجبر کے لیے صرف حکومت ذمہ دار نہیں ہوتی بلکہ بڑی حد تک ہمارا معاشرہ بھی جواب دہ ہے۔کیوں کہ حکومت کے کسی بھی معاملے میں بلواسطہ یا بلا واسطہ طور پر سماج و معاشرے کا دخل ہوتا ہے۔اس سیاق میں پیغام آفاقی کا یہ ناول عصری انسانی معاشرے کے گال پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔انھوں نے اس جبر سے نہ صرف پردہ اٹھایا ہے بلکہ اس کا مداوا بھی پیش کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ آج کی اس بھاگ دوڑ بھری زندگی میں مادہ پرستی انسانیت کے جذبے کو نگلتی جا رہی ہے۔انسانی قدریں رو بہ زوال ہیں۔ایسے میں تمام تر سرکاری ادارے بدنظمی و بدعنوانی کا شکار ہیں۔عدلیہ اور انتظامیہ کی نااہلی کے باعث شریف انسان بھی غلط راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔پیغام آفاقی نے ناول کے پلاٹ اور کرداروں کے توسط سے ان تمام تر مسائل کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔یہ ناول پولیس محکمے کے داخلی انتشار اور بے راہ روی کو نمایاں کرتے ہوئے ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ پورا کا پورا سماجی ڈھانچہ بکا ہوا ہے۔

پیغام آفاقی نے پولیس افسران اور سیاسی رہنماؤں کے کردار کے پس پردہ حکومت میں پھیلی ہوئی لاقانونیت،کرپشن،غنڈہ گردی وغیرہ کو اجاگر کیا ہے۔آج کمزوروں کے لیے انصاف کے دروازے بھی بند ہو چلے ہیں۔اس ناول میں کچہری وعدالتوں میں پھیلے ہوئے انتشار کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ناول میں نیّر نامی ایک انسپکٹر کا کردار ملتا ہے۔وہ نہایت مکار اور موقع پرست انسان ہے۔نیّر،الوک اور اشوک کا ساتھ دیتا ہے۔وہ نیرا سے اناپ شناپ سوالات کرکے اسے پریشان کرتا ہے۔وہ انسان کے روپ میں ایک ایسا بھیڑیا ہے جو نیرا کی عصمت وعفت لوٹنا چاہتا ہے۔لیکن نیرا اس کی ہر حرکت کا معقول جواب دیتی ہے۔ایک جگہ نیر کو مخاطب کرتے

ہوئے وہ شدید غصے میں کہتی ہے کہ:

''آج میں اس پوری بھیڑ کے سامنے یہ بتاتی ہوں کہ آپ مسٹر کمار سے مل کر ہتھکنڈے رچ رہے ہیں۔اور وہ میرا مکان چھیننا چاہتا ہے۔اور آپ مجھے کال گرل بنانا چاہتے ہیں۔اگر مجھے بکھر کر دوبارہ اپنے کو سمیٹنے کے لیے کال گرل بھی بننا پڑے تو میں بنوں گی لیکن میں بکھروں گی نہیں۔......آپ کے اندر ایک کمینہ انسان ہے۔ذلیل کتا۔مسٹر نیّر میں جانتی ہوں کہ یہ ساری پوچھ تاچھ ایک بکواس،ایک غیر قانونی حرکت اور ایک ڈرامہ ہے۔یہ کہتے ہوئے نیرا کی نظریں پوری بھیڑ میں ٹارچ کی روشنی کی طرح نیّر کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔''

(ایضاً،ص:۱۲۷)

پیش نظر اقتباس اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ نیرا تنہا ضرور ہے لیکن کمزور بزدل نہیں۔اس کے ساتھ اس کا ضمیر ہے۔وہ تن تنہا یہ جنگ لڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔زمانے کی بے مروتی اور بے اعتنائی نے اسے شعلہ صفت بنا دیا ہے۔آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب و کامران ہوتی ہے۔نیرا کی فتح میں قاری کو اپنی فتح محسوس ہوتی ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ نازک سے نازک حالات میں بھی اپنے ضمیر و روح کا سودا نہیں کرتی۔کبھی اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کرتی۔اس کے اصول ہی اسے ناسازگار حالات میں زندہ رکھتے ہیں۔اس کا کرایہ دار کمار،تھانہ انچارج اور انسپکٹر نیّر کو رشوت دے کر خرید لیتا ہے۔دونوں نیرا کے خلاف سازشیں رچتے ہیں۔لیکن نیرا آندھیوں میں بھی شمع روشن رکھنے کا ہنر جانتی ہے۔اس کے حوصلے و کوششوں کے آگے تھانے کا پورا عملہ قدرے خوف زدہ رہتا ہے۔انسپکٹر نیّر،کمار سے سنجیدگی و گھبراہٹ کے ساتھ کہتا ہے:

''میں اس لڑکی کو کس خوبصورتی سے ہینڈل کرتا ہوں۔آپ دیکھیے تو۔رفتہ رفتہ تھانے اور کورٹ بھگاتے بھگاتے اور قدم قدم اسمارٹ نس کا استعمال کا موقعہ دیتے دیتے اور ساتھ ہی ساتھ چابکدستی سے اس کے اوپر دباؤ بڑھاتے بڑھاتے میں اس کے پرس کے پیسے آنکھوں کی جھجھک سب کچھ چھین لوں گا اور پھر وہ دن آئیں گے کہ ہماری ہر چوٹ کو وہ اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ روکے گی۔''

(ایضاً،ص:۱۱۹)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ نیرا کے وجود و ضمیر کو کچلنے کے لیے کتنی خطرناک سازشیں کی گئیں۔سوال یہ ہے کہ دنیا کی تمام تر طاقتیں نہ جانے کیوں ظالم قوتوں کا ساتھ دیتی ہیں؟۔وہ چاہیں تو

ظلم واستحصال اور جبر وتشدد کا طوفان تھم سکتا ہے۔ یہ خاموشی درحقیقت ضمیر کی سودے بازی کا نتیجہ ہے۔

الوک شہر کا اسسٹنٹ کمشنر آف پولس ہے۔ وہ ایک دیانت دار اور نیک پولس افسر ہے۔ وہ نیرا کی مدد کرنے کے لیے آگے آتا ہے۔ لیکن اس کے نیک ارادے وفرائض جلد ہی اندھی قوتوں کی سازش کا شکار ہو کر سسکنے و دم توڑنے لگتے ہیں۔ اشوک، الوک کو رنگین آسائشیں فراہم کراتا ہے۔ لڑکی اور شراب کے نشے میں الوک جیسے سادہ لوح نوجوان کو بھٹکنے میں دیر نہیں لگتی۔ پیغام آفاقی نے ناول میں کیبرے ہاؤس کی گھناونی تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ جہاں حوا کی بیٹی کی عصمت دو ٹکے میں بکتی ہے۔ یہاں کی کڑوی سچائیاں چیخ چیخ کر موجودہ سماج کے ناسور کو بیان کر رہی ہیں۔

ناول میں اشوک ایک جگہ کمار سے کہتا ہے ''بوتل اور سولہ سال کی کھول کر، اس کے سامنے رکھ دیں گے، پھر دیکھیں گے الوک کدھر جاتا ہے۔'' کمار اور اشوک اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مدھو نامی ایک خوبصورت و حسین لڑکی کو الوک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اشوک اور کمار، الوک کی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی بلیو فلم تیار کر کے اس کو بلیک میل کرتے ہیں۔ اشوک ویڈیو کیسٹ کے ساتھ کمار کے گھر آتا ہے۔ دونوں ساتھ میں بیٹھ کر اس ویڈیو کو دیکھتے ہیں۔ جنسی ہیجان سے بھرپور آوازوں کی آہٹ سن کر نیرا ٹھٹھک جاتی ہے۔ اور ٹیلی ویژن پر آتی ہوئی تصویروں کو غور سے دیکھنے لگتی۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> ''وہی جنسی ہیجان سے بھرپور آوازیں۔ اور دو ننگے بدن آپس میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے، اور پھر اس میں سے ایک مردانہ چہرا بڑا ہو کر ابھرا...... یہ الوک تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی جیسے یہ مناظر دیکھ رہی ہو۔''
>
> (ایضاً، ص: ۳۶۳)

نیرا کو الوک سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس کے نزدیک الوک فرشتہ صفت انسان تھا۔ جو کسی مجبور کے کام آسکتا تھا۔ لیکن اب اس کی تمام تر امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اس کے خلاف ہے۔ پیغام آفاقی نے اپنے اس ناول میں خود کلامی (Dramatic monologue) سے بہت کام لیا ہے۔ نیرا کے جذبات واحساسات، ارمان وخواہشات اور زندگی کے تئیں اس کے نظریات اور اس کی پوری شخصیت خود کلامی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔

زمانے کی بے توجہی کے سبب اس کی فکر میں غیر معمولی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ وقت اور حالات کی ستم ظریفی کو اس کے اس داخلی مکالمے میں محسوس کیا جا سکتا ہے ''آج میں آگ کے شعلوں میں سارے جراثیم جلا آئی ہوں۔'' اکثر وبیشتر جگہوں پر نیرا کی خود کلامی فلسفیانہ لمس اختیار کر گئی ہے۔ خود کلامی کی کثرت سے کہیں کہیں ناول

کا پلاٹ متاثر ہوا ہے۔ ایسے میں بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔ خود کلامی کی صورت میں نیرا کے دل کی کیفیت دیکھیے:

''یہ پوری کائنات میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ یہ پوری کائنات میرے خلاف کیوں ہے؟ کیا میں غلط، غیر منطقی راستے پر چل رہی ہوں؟ کیا میرے ارادے، میرے خیالات، اور میرے اعمال غیر حقیقی ہیں، مصنوعی، مقامی اور وقتی ہیں؟ کیا آخر کار مجھے ان طاقتوں سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا جو حد نگاہ سے آگے تک چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات ستون بن کر کھڑی ہیں؟ اور یہ سب طاقتیں کمار کے ساتھ ہیں۔ تو میرے مکان کا بچنا غیر فطری اور غیر حقیقی خیال ہے۔ اور میری جنگ مصنوعی...... خلاف فطرت...... کیا میں کائنات کی ساخت کو توڑ کر چل رہی ہوں...... اور میری یہ دشواریاں، کائنات کی ساخت کو توڑنے کے عمل کا حصہ ہیں اور یہ مشقت اسی کی پیداوار ہیں۔ تو میں اس ساخت کو کہاں تک توڑ پاؤں گی۔ اپنے اردگرد کچھ توڑ پائی ہوں لیکن آگے تو یہ پہاڑ کی مانند ہیں...... کیا آخر میری تھکن بھی میری قسمت بن جائے گی۔ اور مجھے ہار تسلیم کرنی پڑے گی۔ تو پھر میں یہ کیوں کر رہی ہوں...... میں نے جس قوت سے جنگ لی ہے، وہ کمار نہیں بلکہ وہ خود کائنات ہے۔ خود لامحدود وسعتوں تک تنہا پھیلی ہوئی۔''

(ایضاً، ص:۳۶۳)

یہ اقتباس خود کلامی کی صورت میں خود احتسابی کا عمل ہے۔ وہ اشوک اور کمار کے علاوہ اپنے آپ سے بھی لڑتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ خود کو سمجھنے کے بعد ہی انسان پر دنیا کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ عرفان ذات اور خود شناسی کے عمل سے گزرنے کے بعد وہ اپنے اندر پوشیدہ قوت و توانائی کو پہچان لیتی ہے۔ وقت اور حالات کے تھپیڑے اسے انگاروں پر چلنا سکھاتے ہیں۔ اب وہ ناسازگار حالات کو بھی اپنے موافق بنا لینے میں کامیاب ہوتی ہے۔ وہ اشوک سے کہتی ہے ''سورج جب آہستہ آہستہ اپنی جگہ بدلتا ہے تو زمین پر موسم بدل جاتے ہیں۔'' (ص:۴۱۲) یہ عین انسانی فطرت ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنی بداعمالیوں پر نادم ہوتا ہے۔ اور احساس گناہ ہی اس کی مثبت سزا ہے۔ نیرا اشوک کے ضمیر کو للکارتے ہوئے کہتی ہے:

''آپ اپنی تاریکیوں پر کیوں قناعت کیے بیٹھے ہیں۔ آپ کے یہاں روشنیوں کی بھی بڑی گنجائش ہے۔ آپ ان انجان وادیوں سے، جن سے آپ کو بہت الجھنا پڑے گا، گھبرائیے نہیں۔ آپ محض مجھے اور میری باتوں کو یاد رکھیئے، جھاڑیاں خود بخود صاف ہوتی چلی جائیں گی۔ اور راہیں بنتی چلی جائیں گی۔''

(ایضاً،ص:۴۱۱)

یہ ناول ان لوگوں کو احتجاج ومزاحمت کا درس دیتا ہے جو خاموشی سے ظلم واستحصال سہتے ہیں۔کیوں کہ ظلم وتشدد کو برداشت کرنے سے ظالم کی مدد ہوتی ہے۔آج بھی ہمارے معاشرے میں کمار و اشوک جیسے مکار وبدکار لوگ موجود ہیں۔انھیں پہچاننے، بے نقاب کرنے اوران کے خلاف احتجاج و بغاوت کی ضرورت ہے۔ عصری معاشرے کو نیرا جیسی غیرت منداورخودکفیل خاتون کی اشد ضرورت ہے تاکہ حق اور انصاف کا علم بلند رہے۔

پیغام آفاقی نے ایک نہایت نازک و بے حد سنجیدہ موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔یہ ناول عصر حاضر کے سماجی،معاشرتی تہذیبی اور سیاسی سروکار سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔انھوں نیرا کی شکل میں اردو ناول کو ایک ایسا زندہ وتابناک کردار دیا ہے جس کی بصیرت اورآ گہی سے معاشرے کوروشنی ملتی رہے گی۔نیرا اپنا مکان بچا کر سماج ومعاشرے اورانسانی حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔تاریکی کوروشنی بخشتی ہے۔اس لیے مکان کو علامتی واستعاراتی انداز فکر کے ساتھ وسیع تناظر میں سمجھنے وپرکھنے کی ضرورت ہے۔

☆☆

اداس نسلیں: ظلم و بربریت کا اعلامیہ

تقسیم ہند کا المیہ ایک اہم تاریخی پڑاؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے نہ صرف ہندو پاک کی سرحدیں طے کیں بلکہ انسانی دلوں کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ اس المناک حادثے کے زیر اثر انسانی رشتے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ ماں باپ، بھائی بہن، بیوی اور شوہر وغیرہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ انسان انسان سے جدا ہو گیا۔

اردو میں تقسیم ہند کے موضوع پر خاصی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں۔ بعض قلم کاروں نے تقسیم کے خارجی مسائل کو اہمیت دی ہے تو بعض نے داخلی و نفسیاتی حالات و کوائف کی عکاسی کی ہے۔ یہاں خارجی مسائل سے مراد ہجرت اور فسادات ہیں۔ کچھ ناول نگاروں نے تقسیم کے اسباب پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے تو کچھ ایک نے اس کے المناک نتائج کو شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تقسیم پر مبنی ناولوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر ناول نگاروں نے تقسیم کے نظریاتی مباحث کو مرکزی اہمیت دی ہے۔ اس نوعیت کے ناول اکثر و بیشتر تعصب اور جانبداری کا شکار ہو گئے ہیں۔ کسی تخلیق کار نے کانگریس کو تو کسی نے مسلم لیگ کو تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ایسے ناولوں میں عدم توازن اور منطقی ربط کی کمی کھٹکتی ہے۔

ان نظریاتی مباحث سے قطع نظر بعض قلم کاروں نے تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے ہجرت اور خون ریزی و بربریت کے دردناک واقعات کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ ایسے ناول تعصب، جانب داری اور مبالغہ آرائی سے یکسر پاک نہیں۔ فسادات اور فرقہ وارانہ جبر و تشدد کے موضوع پر لکھے گئے اہم ناولوں میں عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں''، راما نند ساگر کا ''اور انسان مر گیا''، کرشن چندر کا ''غدار''، حیات اللہ انصاری کا ''لہو کے پھول''، جمیلہ ہاشمی کا ''تلاش بہاراں'' اور قرۃ العین حیدر کا ''میرے بھی صنم خانے'' وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مذکورہ ناولوں میں قتل و خون اور فسادات کے الم ناک واقعات کی حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔ ناول ''اداس

نسلیں''، میں ہجرت کے دوران رونما ہونے والے حادثات کو حقیقت بیانی کے ساتھ منظر عام پر لانے کی سعی کی گئی ہے۔

''اداس نسلیں''، میں ایک وسیع تر پس منظر ملتا ہے۔اس ناول میں تقسیم ہند کے متعلق کئی طرح کے مسائل موضوع بحث ہیں۔ یہ ناول اس عہد کی سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی، تاریخی اور تہذیبی صورت حال کو ادبی حسن کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ دراصل اس ناول میں پہلی جنگ عظیم سے تقسیم ملک و قیام پاکستان تک کے سماجی، سیاسی، تہذیبی، اخلاقی اور معاشی انتشار کو خوبصورتی سے قلمبند کیا گیا ہے۔

ناول کا پلاٹ چار حصوں میں منقسم ہے۔ان منقسم پلاٹ کو چار عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔یعنی پہلے کو''برٹش انڈیا'' دوسرے کو''ہندوستان'' تیسرے کو ''بٹوارہ'' اور چوتھے کو''اختتامیہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ ناول کے ابتدائی دو عنوانات جنگ عظیم اور تحریک آزادی سے وابستہ ہیں۔جبکہ آخر کے ابواب تقسیم، قیام پاکستان ، ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی ہیں۔موضوع کے پیش نظر یہاں ہجرت کی المناکیوں، فسادات اور قتل و غارت گری پر خاص توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

ناول''اداس نسلیں''، میں پنجاب کے ایک گاؤں روشن پور کا ذکر ہے۔اس گاؤں میں سکھ اور مسلمان دو قومیں رہتی ہیں۔مسلمانوں کا نمائندہ کسان احمد دین اور سکھوں کا سربراہ کسان پرنام سنگھ ہے۔اس ناول کے کرداروں میں روشن علی خان، نعیم، عذرا، علی، پرویز، عائشہ اور شیلا ماتھر عرف بانو وغیرہ کے نام اہم ہیں۔نعیم اس ناول کا ہیرو اور عذرا ہیروئن ہے۔

نعیم روشن پور کے ایک خوش حال کسان نیاز بیگ کا بیٹا ہے۔عذرا روشن علی خان کی بیٹی ہے۔نعیم کی شادی عذرا سے ہوتی ہے۔عذرا کے والد یعنی روشن علی خان آغا جنگ آزادی سے قبل رہتک کلکٹریٹ میں سرکاری ملازم تھے۔ایک انگریز افسر کی جان بچانے کے عوض میں انھیں آغا کا خطاب اور روشن پور کا علاقہ جاگیر کے طور پر عطا کیا گیا۔ان کی حویلی''روشن محل'' کے نام سے مشہور ہے۔ایک جاگیردار کی بیٹی سے شادی ہونے کے سبب نعیم کو گاؤں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔علی نعیم کا سوتیلا بھائی ہے۔عائشہ علی کی بیوی ہے۔

یہ ناول ایک وسیع پس منظر کا حامل ہے۔ناول کے آخری دو ابواب فرقہ واریت کے طوفان سے ہم آہنگ ہیں۔ناول کے کینوس پر فسادات اور فرقہ واریت ہی اہم موضوع کے بطور ابھرتے ہیں۔اس میں پنجاب کے کسانوں کی زندگی، جاگیردار طبقے کے مظالم، مزدوروں وغریبوں کی بدحالی اور شکست خوردگی وغیرہ سب کچھ ہے۔

پس منظر کی وسعت کے اعتبار سے یہ ناول پریم چندر کے ناول ''گئودان'' سے میل کھاتا ہے۔''گئودان'' کی طرح اس ناول میں بھی زمیندار اور مزدور طبقے کی سیاسی کشمکش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی

ہے۔اس کے علاوہ اس ناول میں تقسیم سے قبل کے سماجی ،تاریخی اور سیاسی نشیب وفراز کی واضح تصویریں ملتی ہیں۔مثلاً جہد آزادی، کانگریس ومسلم لیگ کی رقابتیں، انگریزوں کی سازشیں، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ، ڈانڈی مارچ کا واقعہ، عدم تعاون کی تحریک اور جلیانوالہ باغ کا المیہ جیسے واقعات تفصیل واثر انگیزی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

ناول ''اداس نسلیں'' کے آخر کے دو عنوانات یعنی ''بٹوارہ'' اور ''اختتامیہ'' تقسیم ہند، ہجرت اور فسادات کے دردناک واقعات پر مشتمل ہیں۔اس ناول میں ہجرت اور مذہبی قتل و غارت گری کے دل سوز اور الم ناک واقعات مندرج ہیں۔واضح رہے کہ حصول آزادی اور تقسیم وطن سے قبل ہی سے پنجاب اور دوسرے سرحدی علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔لیکن تقسیم اور قیام پاکستان نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

ہندوستان کی قدیم ترین مشترکہ تہذیب وثقافت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اس سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئی۔ پورا ملک اجتمائی قتل وخون اور بربریت کا شکار ہو گیا۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ جبر وتشدد کے اس عالم میں ہجرت کا غیر انسانی عمل وقوع پذیر ہوا۔اس کی آگ سے شہر اور دیہات دونوں جھلسے۔لاتعداد لوگ اپنی سرزمین اور اپنا آبائی وطن چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ جب ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں تو مہاجروں کے قافلے در قافلے نکلنے شروع ہو گئے۔موت سر پر سوار ہوئی تو نہ جانے کتنے لوگ افراتفری کی صورت میں منزل کے تعین کے بغیر ہی بے سمت ورفتار نکل پڑے۔عبداللہ حسین نے اپنے اس ناول میں تقسیم ملک کے نتیجے میں پیدا شدہ ہجرت اور فسادات کے دل دوز حالات و واقعات کی نہایت جاندار اور حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ناول کے کردار مثلاً نعیم ،عذرا،علی، بانو اور بوڑھا پروفیسر وغیرہ ان الم ناک حالات ومسائل سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔

حالات کی ستم ظریفی کے پیش نظر روشن محل کے زیادہ تر افراد جائے امان کی تلاش میں پاکستان ہجرت کر جاتے ہیں۔لیکن روشن آغا لوگوں کے سمجھانے کے باوجود روشن محل نہیں چھوڑتے۔انھیں اپنا آبائی وطن اور اپنی مٹی عزیز ہے۔انھیں ترک وطن کے تصور سے شدید کوفت ہوتی ہے۔لیکن سیاسی اور تاریخی جبر کے ہاتھوں سب مجبور ہوتے ہیں۔آخر کار چند ہی گھنٹوں کے بعد روشن محل کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔مجبوراً روشن آغا کو بھی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ان کے سامنے بھی ہجرت کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔روشن محل کو آگ لگانے والے ہندو اور سکھ فرقے کے لوگ تھے۔اس غم انگیز اور افسوس ناک صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہوئے عبداللہ حسین لکھتے ہیں:

''شام تک روشن محل کے تمام لوگ غائب ہو گئے۔ چوکیدار اور خاکروب تک۔ صرف روشن آغا کا ملازم خصوصی حسین، وفاداری سے ان کے بند دروازے سے لگ کر بیٹھا رہا۔ رات سے پہلے پہلے روشن محل کو آگ لگا دی گئی..... بلوائیوں کے تین گروہ یکے بعد دیگرے جانے کہاں سے وارد ہوئے اور نہایت خاموشی سے اس مہیب اور دو منزلہ عمارت کا مشرقی حصہ جلنے لگا۔..... روشن آغا اور حسین پچھلے دروازوں سے جان بچا کر بھاگے۔ جاتے جاتے انھوں نے بلوائیوں کی جھلک دیکھی۔ وہ لمبے تڑنگے سکھ کسان اور چھوٹی ذاتوں کے کالے کالے لوگ تھے جو ان کا سامان نکال نکال کر لان میں جمع کر رہے تھے اور اسے آگ لگا کر بھوتوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔''

(اداس نسلیں، عبداللہ حسین، ص:۸۱۶)

اسی افراتفری کے عالم میں دہلی سے ایک قافلہ پاکستان کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ یہ قافلہ کوئی ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ ناول کا ہیرو نعیم بھی اس قافلے میں شامل ہوتا ہے۔ نعیم کے رشتہ دار اور احباب بھی اس کے ساتھ ہیں۔ ناول میں اس مہاجر قافلے کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ ناول نگار نے اس قافلے پر ڈھائے گئے مظالم، مہاجرین کی ذہنی ونفسیاتی کیفیت، انجانی راہوں میں درپیش مصائب ومشکلات وغیرہ کی اچھوتی اور سچی تصویر کشی کی ہے۔

دہلی سے روانہ ہونے والا یہ قافلہ پنجاب اور انبالہ کی سرزمین سے ہو کر گزرتا ہے۔ پنجاب پہنچتے ہی حملے تیز سے تیز تر ہوتے گئے اور یہ قافلہ کم ہوتا گیا۔ بلوائیوں اور فسادیوں کے جھنڈ کے جھنڈ کلہاڑی، بلم، تلوار، گنڈاسا اور لاٹھیوں سے ان مہاجرین کو اپنے جبر وتشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ لوگ مرتے رہے اور نیا قافلہ پرانے قافلے میں شامل ہوتا رہا۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں کی چیخ وپکار کی دردناک اور فلک شگاف آوازیں ہر طرف اٹھتی رہیں۔ سڑک کے کنارے بچوں، مردوں اور عورتوں کی ننگی لاشیں پڑی رہتیں۔ عبداللہ حسین نے موت اور بربریت کے ان خوف ناک اور دل سوز مناظر کو بے باک انداز میں پیش کیا ہے۔ مہاجر قافلے پر ٹوٹنے والی اس قیامت کا خوف ناک منظر ملاحظہ ہو:

''قافلے کا حجم حیرت انگیز طور پر گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوں جوں وہ پنجاب میں اندر آتے گئے حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ حملے مسلح اور نیم مسلح دستوں کی طرف سے ہو رہے تھے جو کہ زیادہ تر دیہات میں سے آتے تھے۔ پہلے پہل تو قافلے والے کچھ نہ کچھ ان کا مقابلہ کرتے رہے، اب وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ حملہ وروں کے ہتھیاروں کے سامنے

خاموشی سے مر جاتے یا بھاگنے لگتے۔ ہر حملہ کے بعد مردوں اور زخمیوں کو پھلانگتے ہوئے ،روندتے ہوئے قافلے والے آگے نکل جاتے ،کئی ایک سمت کا احساس کھوکر قافلے سے بچھڑ جاتے اور نو جوان عورتیں اغوا کر لی جاتیں..... بعض دفعہ اگلے قافلوں کے حملہ ور انھیں بغیر کچھ کہے گزر جانے دیتے۔ بلوائی اور حملہ ور مار مار کر اس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کے کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش،خوف زدہ کوچ سے ہی محظوظ ہوتے رہتے۔کبھی کبھی وہ مردوں اور زخمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے، بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گزر جاتا۔''

(ایضاً،ص:۱۴۱-۸۴۰)

اس اقتباس سے بلوائیوں اور حملہ وروں کی بربریت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔عبداللہ حسین نے ان مخصوص حالات و مسائل کی عکاسی جس شدت کے ساتھ کی ہے،اس کی مثال دوسروں کے یہاں ملنی مشکل ہے۔انھوں نے ہجرت کے کریہہ مسائل کی ایک ایک جزئیات کو بیان کیا ہے۔

قافلے میں بچے، بوڑھے اور جوان سب شامل ہیں۔قافلے میں عورتوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ یہ قافلہ راستے بھر حملہ آوروں کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنتا رہا۔ بے گناہ عورتیں اور معصوم بچے بھی بلوائیوں کی بربریت کا شکار ہوتے رہے۔نو جوان عورتوں کو سرعام اغوا کر کے ان کی عصمت دری کی گئی۔انھیں زندہ جلایا گیا۔نعیم اس ناول کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ وہ دہلی سے اس قافلے میں شریک ہوتا ہے۔اس قافلے پر ٹوٹنے والی اس قیامت کو نعیم خاموشی سے دیکھتا ہے۔قافلے پر ٹوٹنے والی اس قیامت کا خوفناک منظر ملاحظہ ہو:

''نعیم کے سامنے وقفہ وقفہ پر پر حملے ہو رہے تھے۔سب کے نزدیک اہم ترین کام چلتے جانا اور اکٹھے رہنا تھا۔لوگ مر رہے تھے۔ جو مارے جانے سے بچ رہتے،وہ تھک کر گر رہے تھے۔سامان کو آگ لگائی جارہی تھی۔لوگ خوراک کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔کوئی پلیا کے پتھر کے سہارے بیٹھا اور کوئی درخت کے کنارے کھڑا کھڑا مر گیا تھا۔عورتوں کے ننگے اور مردہ جسم بے شرمی سے پھیلے ہوئے تھے۔جنگلی جانور اور پرندے ان پر پل رہے تھے۔ جو زندہ تھے مستقل چل رہے تھے اور میاں بیوی بھائی بہن اور ماں بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے۔اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو دنیا کی تاریخ میں ایسے قافلوں کے ساتھ ہمیشہ ہوتا آیا ہے''

(ایضاً،ص:۸۴۲)

درج بالا اقتباس کا ایک ایک لفظ ظلم وزیادتی اور جبر وتشدد کو آشکارا کرتا ہے۔ان اقتباسات کے پیش نظر دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان اس قدر ظالم ودرندہ کیوں کر اور کیسے ہوسکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ انسان حیوانیت اور شیطنیت کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔دوسروں کے خون میں نہانا اس کا شیوہ بن گیا تھا۔نعیم یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔مہاجرین پر کی جانے والی بربریت اور درندگی کو مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے نعیم ایک نوع کی بے حسی اور دیوانگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔آخر کار وہ حملہ وروں اور بلوائیوں سے بچنے کی کوشش بھی تقریباً چھوڑ دیتا ہے۔۔

اس کے قدم بھی بری طرح لڑکھڑانے لگے تھے۔وہ اپنے سوتیلے بھائی علی اور دوسرے دوستوں کی مدد سے بچتا رہا۔آخر کار نعیم ان درندہ صفت بلوائیوں اور فسادیوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔حملہ ور اسے بے رحمی سے قتل کر دیتے ہیں۔ہجرت اور تباہی کے اس عالم میں کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔سب کو اپنی اپنی فکر تھی۔لہذا نعیم کی موت سے قافلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔اب بھی یہ قافلہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔بچے کھچے لوگوں کا یہ کارواں کسی طرح لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس ناول میں لاہور ریلوے اسٹیشن کا ذکر ملتا ہے۔مہاجرین اور شرنارتھیوں کے لیے یہ ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔لاہور سے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کو لے کر ٹرین ہندوستان آتی ہے اور ہندوستان سے مسلم مہاجرین بذریعہ ٹرین اسی جگہ پہنچتے ہیں۔ہندوستان سے پاکستان جانے والا یہ قافلہ لاہور پہنچ کر کسی قدر اطمینان اور راحت کی سانس لیتا ہے۔نو تشکیل شدہ ’’مملکت خداداد‘‘ یعنی پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ان مسلم مہاجرین کو جان کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

ہندوستان کی سرحد پار کرتے ہی ان لٹے پٹے لوگوں کی ذہنیت یکسر بدل جاتی ہے۔ان مہاجرین کے دلوں میں نفرت، دشمنی اور فرقہ واریت کا زہریلا سانپ پھن اٹھانے لگتا ہے۔وہ اپنی تباہی اور خود پر ڈھائے گئے ظلم وتشدد کا بدلہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔اس طرح لاہور اسٹیشن پر فسادات اور قتل وخون کا بازار ایک بار پھر سے گرم ہو جاتا ہے۔ہندوستان آنے والے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کی ایک بڑی تعداد تھوڑی ہی دیر میں ہلاک کر دی جاتی ہے۔

عبداللہ حسین نے ناول ’’اداس نسلیں‘‘ کے کینوس پر ان تمام تر مناظر کو خوبصورتی سے فکشن کا روپ دے دیا ہے۔انھوں نے ان دردناک اور افسوس ناک واقعات میں حقیقت کا رنگ کچھ اس طرح بھر دیا ہے کہ ظلم و استحصال اور جبر وتشدد کی واضح تصویریں نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔لاہور ریلوے اسٹیشن پر رونما ہونے والے فسادات کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’گرجتی ہوئی ایک ریل گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رکی مگر اس گاڑی سے کوئی نہ اترا۔کیوں کہ وہ

شمال کی طرف سے بھری ہوئی آئی تھی اور ہندوستان جا رہی تھی۔ گاڑی کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے اور چند ایک کھلی کھڑکیوں میں سے بچوں کے زرد اور خوف زدہ چہرے نظر آرہے تھے۔ چاروں طرف کشیدگی کا عارضی سناٹا پھیل گیا اور غیر معمولی طور پر بڑھتا چلا گیا۔ پھر باہر ایک شور اٹھا اور واویلا کرتے ہوئے لوگوں کا چھوٹا سا ہجوم اسٹیشن میں داخل ہوا۔ سامنے آتے ہی بظاہر غیر مسلح لوگوں میں سے ایک نے جیب سے پستول نکال کر ہوا میں دو فائر کیے۔ دوسرے نے اس کے ہاتھوں سے پستول چھین کر کھڑکی کے شیشے سے منھ لگا کر باہر دیکھتے ہوئے ایک زرد رو بچے کا نشانہ لیا۔ پھر پلیٹ فارم پر سے تمام مردہ اور نیم مردہ لوگ حیرت انگیز جوش اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کر گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے ٹوٹنے کی آواز اکا دکا ہوتے ہوئے فائروں کی خشک پٹاخے دار آواز سے رل مل گئی۔ ایک عورت کی آواز تھی ظالم، قاتل میرے خاوند کو، میرے بچے کو مار دیا۔ مجھے بھی مار دو۔ مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ عورت بولتے بولتے رک گئی۔ پھر وہ ایک دم پیچھے ہٹی اور وقت ضائع کیے بغیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چھاتی پر سے اپنا ململ کا کرتہ دامن تک پھاڑ ڈالا۔''

(ایضاً، ص:۸۷۴)

یہ اقتباس ظلم و بربریت کی شدت کو انتہائی بے باکی سے بے نقاب کرتا ہے۔ ہجرت کے اس سیلاب میں عورتوں کے ساتھ بھی غیر انسانی سلوک کیے گئے۔ ان کا استحصال کئی طرح سے کیا گیا۔ خواتین کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کی اجتماعی عصمت دری کی گئی اور انھیں زندہ جلایا گیا۔ ہجرت کے جانکاہ سفر میں بے یار و مددگار حوّا کی بیٹی چیختی اور چلاتی رہی۔ لیکن درندہ اور بھیڑیا صفت لوگوں کو اس کی حالت زار پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اس ناول میں عورتوں کی خستہ حالی اور مجبوری کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ہجرت کے درمیان حملہ ور جوان لڑکیوں کو جبراً اٹھالے جاتے اور ان کی اجتماعی آبرو ریزی کر کے انھیں بے یار و مددگار جنگلوں میں چھوڑ دیتے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب قافلہ دن بھر کے تکان کے بعد شب گزاری کے لیے کہیں قیام کرتا تو یہاں بھی عورتوں کا جنسی استحصال ہوتا۔ یعنی پیٹ کی آگ بجھانے کے عوض میں عورتوں کو اپنے جسم کا سودا کرنا پڑتا۔ اشیائے خوردنی مثلاً چاول، آٹا کے بدلے قافلے کے لوگ ہی عورتوں سے لذت یاب ہوتے۔ یہ عجیب انسانی ٹریجڈی ہے کہ کسی کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کسی کے جسم کی آگ بجھانی پڑتی ہے۔ دونوں آگ میں کس قدر فرق ہے۔ ایک آگ پیٹ میں جلتی ہے تو دوسری حیوانیت اور شیطنت میں نمو پاتی ہے۔ ایک مجبوری ہے تو دوسری ہوس کی علامت۔ یہ بات قافلے کے دوسروں لوگوں سے پوشیدہ بھی نہ تھی۔ لیکن حالات کے سامنے

سب بے بس ولا چار تھے۔عبداللہ حسین نے اس نوعیت کے جبر واستحصال کو بھی ناول میں اجاگر کیا ہے۔قافلے کا ایک منظر دیکھیے :

''جن کے پاس آٹا نہ تھا وہ بھاری رقمیں دے کر پڑوسیوں سے آٹا خریدنے لگے۔جن کے پاس پیسے نہ تھے وہ رات کا انتظار کرنے لگے۔جب اندھیرے میں چوری کی جاسکتی تھی۔یا گھر کی عورتوں میں سے کسی جوان اور خوش شکل کو تھوڑی دیر کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کر کے معاوضے میں اشیائے خوردنی حاصل کی جاسکتی تھی۔''

(ایضاً،ص:۸۴۴-۴۵)

ظلم واستحصال اور حیوانیت کی ایسی داستان انسانی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ہجرت نے لاتعداد مسائل پیدا کیے۔عبداللہ حسین نے اس ناول میں تقسیم کے نتیجے میں پیدہ شدہ حالات ومسائل کے ہر ممکنہ پہلو کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔یہ ناول ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات کے المیے کی پیش کش کے اعتبار سے تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔فسادات اور فرقہ واریت کی آندھی کو اس شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ناول میں جگہ جگہ جذباتیت در آئی ہے۔لیکن انھوں نے ان نکات کو خوبصورتی سے فکشن کا روپ دے دیا ہے۔ بلا شبہ''اداس نسلیں''تقسیم اور ہجرت کے موضوع پر ایک منفرد ناول ہے۔میں اپنی بات ڈاکٹر خالد اشرف کی اس رائے کے ساتھ ختم کرتا ہوں:

''مہاجر قافلے پر گزرنے والی مختلف ذہنی ونفسیاتی کیفیتوں، راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں اور جان مال کے نقصان کو عبداللہ حسین نے اس قدر مہارت اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔کہ تمام اردو ادب میں ہجرت کرنے والے قافلوں کی اتنی حقیقی تصویر کہیں اور نہیں ملتی۔''

(برصغیر میں اردو ناول،ڈاکٹر خالد اشرف،ص:۲۰۷)

☆☆

غدار: فرقہ واریت کی عمدہ مثال

کرشن چندر اردو کے معروف فکشن نگار ہیں۔انھوں نے کئی اہم ناول تخلیق کیے ہیں۔''غدار'' ان کا مشہور ناول ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آیا۔تقسیم ہند کے المیے پر مبنی یہ ناول ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات کے وحشت ناک منظر کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔تقسیم کے موضوع پر لکھے گئے ان کے دوسرے ناولوں میں ''مٹی کے صنم'' اور ''میری یادوں کے چنار'' کے نام اہم ہیں۔انھوں نے اس موضوع پر کامیاب افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔ان کا مشہور افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' ان کی انسان دوستی اور ان کے نیک وصالح جذبات واحساسات کی چغلی کھاتا ہے۔

ناول ''غدار'' مغربی پنجاب کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے۔بیج ناتھ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ناول ''غدار'' کی کہانی بیج ناتھ کی یادداشتوں پر مبنی ہے۔اس ناول میں تقسیم کے زیر اثر ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے المیے کو بڑے ہی مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ناول ''غدار'' ۲/اگست ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے اور اسی سال کے اگست مہینے کے اواخر تک کے اندوہ ناک واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔اس ناول کی ابتداء پنجاب کے لالہ گاؤں سے ہوتی ہے۔یہ گاؤں سوبھا سنگھ اسٹیشن کے قریب ہے۔لالہ گاؤں ناول کے مرکزی کردار بیج ناتھ کا ننہال ہے۔

اس ناول میں ہجرت کے کرب ومصائب اور قتل وغارت گری کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔کرشن چندر نے ہجرت اور فسادات کے طوفان میں محبت والفت کی شمع روشن کی ہے۔انھوں نے علی پور سیداں کے پیر قلندر شاہ اور سرغنہ بلو جیسے فرقہ پرست کردار کے ذریعہ انسان دشمنی ومذہبی تشدد کو پیش کیا ہے تو بیج ناتھ وشاداں اور امتیاز وپاروتی کی داستان عشق کے ذریعہ انسان دوستی ومذہبی رواداری کا چراغ بھی جلایا ہے۔

ناول ''غدار'' میں مختلف مذاہب اور مختلف قوم وملت کے لوگوں کی نمائندگی ملتی ہے۔اس میں کئی طرح

کے کردار ہیں۔ان میں سے بعض کردار فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں تو بعض انسانیت اور بھائی چارگی کے علم بردار ہیں۔اس ناول میں نوجوان کرداروں کی خاصی تعداد ہے۔ان کرداروں کے توسط سے اس عہد کی کشمکش کو شدت سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ ناول ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات کو بے باکی اور حقیقت پسندی کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔لالہ گاؤں میں برہمن وکھتری اکثریت اور مسلمان اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس گاؤں کی سب سے اونچی حویلی محلاں کہلاتی ہے۔نمبردار سربلند اپنے بیٹے طفیل اور بیٹی شاداں کے ساتھ اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔بیج ناتھ کی نانی اسی گاؤں کی باشندہ ہیں۔بیج ناتھ بھی اپنی نانی ماتا ایشر کور کے ساتھ لالہ گاؤں میں رہتا ہے جبکہ اس کا آبائی وطن کوٹلی سودکان ہے۔کوٹلی سودکان، ضلع گورداس پور کے تحصیل شکرگڑھ میں واقع ہے۔لالہ گاؤں سے قریب ہی ایک گاؤں علی پور سیداں ہے۔اس گاؤں میں مسلم آبادی زیادہ ہے۔لالہ گاؤں میں مختلف مذاہب وفرقے کے لوگ امن وآشتی اور مذہبی رواداری کے ساتھ رہتے ہیں۔

تقسیم ہند کے سبب ملک کے طول وعرض میں فسادات کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ہر جگہ بدامنی پھیل جاتی ہے۔لالہ گاؤں بھی اب فرقہ واریت سے محفوظ نہیں رہتا۔آس پاس کے علاقے سے فسادات کی خبریں موصول ہونے لگتی ہیں۔قتل کی دھمکیاں تک ملتی ہیں۔پیر قلندر شاہ علی پور سیداں کا رہنے والا ہے۔وہ فرقہ واریت کو ہوا دیتا ہے۔وہ لالہ گاؤں کے نمبردار سربلند کو خون ریزی کے لیے اکساتا ہے۔اس نے سربلند کو اطلاع دی کہ پندرہ اگست تک گاؤں کے تمام ہندو نوجوانوں کو قتل کر دیا جائے۔اور آس پاس سے جمع ہوئی عورتوں کو رکھ لیا جائے۔اس نے اس بات کی بھی دھمکی دی کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو علی پور سیداں کے مسلمان یہ کام پورا کریں گے۔یہ منحوس خبر سنتے ہی لوگوں کے دلوں میں خوف ودہشت بھر گئی۔فرقہ وارانہ نفرت وزہر سے بھرا ہوا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’پیر قلندر شاہ نے کہا ہے، پندرہ اگست تک گاؤں میں جتنے ہندو جوان ہیں، ان سب کو قتل کر دیا جائے۔جتنی جوان عورتیں ہندوؤں کی یہاں اکٹھی ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں یا آس پاس کے علاقوں سے آرہی ہیں، ان سب کو رکھ لیا جائے۔البتہ بوڑھے مردوں، عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیا جائے۔‘‘

(غدار، کرشن چندر، ص:۱۰)

سربلند نیک انسان ہیں۔وہ مذہبی رواداری اور بھائی چارگی میں یقین رکھتے ہیں۔انھوں نے پیر قلندر شاہ کی باتوں پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور گاؤں کے دہشت زدہ ہندوؤں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔وہ بیج ناتھ کی

نانی ماتا ایشر کور سے نہایت جذباتی لہجے میں کہتے ہیں:

''اماں! ہم تیرے بیٹے ہیں۔علی پور سیداں والے ہمارے جیتے جی اس گاؤں کی بہو بیٹیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے۔بستی کے سارے مسلمانوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے۔''

(ایضاً،ص:۱۲)

افسوس کہ پانچ اگست کی شام کو علی پور سیداں کے مسلم فسادیوں نے لالہ گاؤں پر حملہ کر دیا۔نمبردار سربلند اور دوسرے مسلمان بستی کے ہندوؤں کو حملہ وروں سے بچا پانے میں ناکام رہے۔لوگ بدحواس ہو اٹھے۔عجب افراتفری کا عالم تھا۔لوگ بے رحمی سے کاٹے گئے۔کچھ لوگ جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ناول میں ہجرت کا عمل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔گاؤں کی مذہبی رواداری اور آپسی میل محبت نفرت اور مذہبی تعصب کی نذر ہوگئی۔جان و مال کی حفاظت کی غرض سے لوگ قافلے کی شکل میں بھاگنے لگے۔ہجرت اور خوف و دہشت کا منظر ملاحظہ ہو:

''پانچ اگست کی شام میں گاؤں علی پور سیداں کی طرف سے ڈھول پیٹے جانے لگے۔ڈھولوں کی آواز بلند تر اور قریب تر ہوتی گئی۔محلاں کے اندر عورتیں چیخیں مار کر رونے لگیں۔بہت سی عورتیں بے ہوش ہوگئیں۔بچوں بالوں نے رو رو کر کہرام مچا دیا۔عین اسی وقت نمبردار سربلند نے آ کر کہا علی پور سیداں سے پانچ سو مسلمانوں کا جتھا آ رہا ہے۔ہم لوگ مداخلت کرنے والے کل پچاس آدمی ہیں۔اب آپ کو بچا نہیں سکتا۔آپ لوگ اپنی اپنی فکر کیجیے۔''

(ایضاً،ص:۱۳)

اس اقتباس سے تقسیم کے زیر اثر ہونے والی ہجرت اور بربریت کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔شاداں کا بھائی طفیل بیج ناتھ کو لاہور بھاگنے میں مدد کرتا ہے۔لاہور میں بھی فسادات کا سلسلہ جاری تھا۔لاہور میں بیج ناتھ کی ملاقات اس کے ایک دوست میاں سے ہوتی ہے۔اس کا دوست میاں کسی طرح بیج ناتھ کو بلوائیوں اور فسادیوں سے بچا پانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

کرشن چندر نے میاں کے کردار کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد و رواداری کی مثال پیش کی ہے۔حالات کی بربریت کے سبب بیج ناتھ وہاں سے بھاگ کر کسی طرح اپنے آبائی وطن کوٹلی سودکاں پہنچتا ہے۔کوٹلی سودکاں کا ماحول ابھی زہر آلود نہ ہوا تھا۔لیکن حملے کی دھمکیاں یہاں بھی موصول ہو رہی تھیں۔لوگ رات رات بھر جاگ کر رکھوالی کرتے۔خوف و دہشت کے باعث نیند تک نہ آتی۔آخرکار ایک روز صبح صبح بجے ٹھیک سے ابھی جاگے بھی نہ تھے کہ یہاں بھی حملہ ہوگیا۔ناول کا ہیرو بیج ناتھ اس دردناک حادثے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''ابھی ہم لوگ ٹھیک طرح سے جاگے بھی نہ تھے۔ بچے بالے تو سو رہے تھے۔ میں خود رات کا جاگا ہوا دیر سے سویا تھا۔اس لیے جب گلی میں ڈھول بجنے لگے، فسادیوں کے نعرے بلند ہونے لگے اور عورتوں بچوں کی چیخ و پکار سنائی دی تو میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔آخر جب ڈھولوں، نعروں اور چیخوں کی آواز دور ہو گئی اور دب سی گئی تو میں لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے رکا اور وحشت سے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔''

(ایضاً،ص:۴۲)

حملہ وروں سے خوف زدہ ہو کر بیج ناتھ کمادوں کے کھیت میں چھپ گیا۔ وہ شدید خوف کے سبب تین دن تک کھیت میں پڑا رہا۔ جب بھوک پیاس نے شدت اختیار کی تو وہ دبے پاؤں کھیت سے باہر آیا۔گھر میں سناٹا پسرا ہوا تھا۔گھر کے سارے افراد غائب تھے۔صرف گھر میں اس کے دادا جی کی لاش بے حس وحرکت پڑی تھی۔ یہ منظر دیکھتے ہی بیج ناتھ بدحواس ہو اٹھتا ہے۔ وہ اس اندوہ ناک صورت حال کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میرا دادا دہلیز پر مرا پڑا تھا۔اس کا جسم پھول گیا تھا۔اس کا ایک ہاتھ دہلیز کے باہر تھا اور ایک ہاتھ دہلیز کے اندر تھا۔اور دہلیز کے باہر ہمارے گھر کی کتیا کان لٹکائے دادا جی کی لاش کے قریب بےحس حرکت بیٹھی تھی۔ میں دادا جی کے اوپر سے چھلانگ لگا کے گھر کے اندر چلا گیا۔
''

(ایضاً،ص:۴۴-۴۳)

کتنے افسوس اور غم کا مقام ہے کہ ان حملہ وروں اور فسادیوں نے بزرگوں کو بھی نہیں بخشا۔ دراصل حیوانیت اور درندگی کا ایسا گندا کھیل کھیلا گیا جس کا تصور کرنا محال ہے۔اس ناول میں رومی نامی ایک کتیا کا کردار ملتا ہے۔اس کتیا کے ذریعہ کرشن چندر نے نام نہاد مہذب انسانی معاشرہ پر گہرا طنز کیا ہے۔ بے یارو مددگار بیج ناتھ شدید قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اسے ہر طرف موت کا بھیانک چہرا نظر آتا ہے۔اب وہ ہندوستان آنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ جیسے ہی چلنے کے لیے قدم بڑھاتا ہے، رومی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ بیج ناتھ رومی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''تو کہاں جائے گی کتیا..... تجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔تو انسان تھوڑی ہی ہے کہ تجھے اپنی جان کا ڈر ہو۔ یہ تو سب تہذیب کی باتیں ہیں۔اونچے مذہب اور اخلاق کے جھگڑے ہیں۔ یہ تلوار تو بہت بلند اصولوں کی حمایت میں نکلی ہے۔شکر کر کہ تیرا گلا اس سے کاٹا نہ جائے گا۔شکر کر تو غیر مہذب ہے۔ جاہل اور بے اخلاق ہے۔شکر کر کہ تجھے یہ تک معلوم نہیں کہ مذہب کیا ہے۔تو

نے کبھی سندھیا نہیں کی ۔کبھی پانچ وقت نماز نہیں پڑھی ۔تو کبھی کسی گرجا،مندر،مسجد نہیں گئی۔تو نے کبھی آزادی کا مفہوم نہیں سمجھا۔کبھی کسی سیاسی لیڈر کی تقریر نہیں سنی۔شکر کر کہ تو کتیا ہے۔انسان نہیں ہے۔ بھاگ جا۔میرے پیچھے مت آ۔کیوں کہ میں ایک انسان ہوں اور اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے انسانوں سے بھاگ رہا ہوں۔مگر تجھے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔کیوں کہ تو کتیا ہے۔انسان نہیں ہے''

(ایضاً،ص:۴۷-۴۶)

اس اقتباس کا ایک ایک لفظ سماج کے کھوکھلے پن اور شیطنیت کو بے نقاب کرتا ہے۔یہاں پر کتنی فکر انگیز باتیں کی گئی ہیں۔کرشن چندر نے رومی کے کردار کے پس پردہ ترقی یافتہ تہذیب و ثقافت،علم و ادب،سیاست،مذہب اور انسانی اخلاق و اقدار وغیرہ کا پردہ چاک کیا ہے۔ظاہر ہے کہ یہاں پر انسانی ہمدردی،انسان دوستی اور بھائی چارگی کا آفاقی جذبہ کارفرما ہے۔انھوں نے انسانیت کی نظر سے ان مسائل کو دیکھا اور سمجھا ہے۔دراصل نفرت،تعصب اور حیوانیت کے اس سیلاب میں انسان جانوروں سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔اس کے اندر درندوں جیسی صفت پیدا ہو گئی تھی۔

اولادِ آدم کی حیثیت سے سب آپس میں برابر ہیں۔مذہب کے نام پر پھر یہ کیسی دشمنی تھی؟کیسی نفرت تھی؟کیا دنیا کا کوئی مذہب فساد اور قتل وخون کی ترغیب دیتا ہے؟مذہب تو امن و آشتی اور انسانی بقا چاہتا ہے۔ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے والے ایک دوسرے کے جانی دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟کیا انسانیت کی پیشانی پر لگا یہ بدنما داغ مٹ سکتا ہے۔

فسادات کی آندھی میں مارے گئے ان معصوم بچوں نے کون سی خطا کی تھی؟بے گناہ عورتوں کو ان ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں دی گئی؟ان کی عصمت وعفت کو سرِعام کیوں نیلام کیا گیا؟حوا کی بیٹی در بدر بھٹکنے پر کیوں مجبور ہوئی؟ماں،باپ،بھائی،بہن،بیوی اور شوہر وغیرہ کے رشتے کیوں بکھر گئے؟ناول کے مطالعہ کے بعد اس طرح کے بہت سارے سوالات ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔کرشن چندر نے اس ناول کے ذریعہ نام نہاد تعلیم یافتہ اور مہذب معاشرے کو آئینہ دکھلایا ہے۔

اس ناول میں راوی ندی کا کردار بھی موجود ہے۔یہ ندی پاکستان کی سرحد کو ہندستان کی سرحد سے جدا کرتی ہے یعنی راوی ندی ہند و پاک کے درمیان سرحد کا کام کرتی ہے۔ہندوستان اور پاکستان کے قافلے اس ندی پر بنے پل سے ہو کر گزرتے ہیں۔دونوں طرف کے قافلے کو پل پار کرنے کے لیے دو گھنٹے کا وقت دیا جاتا تھا۔کرشن چندر نے سرحد پار کرنے کی صورت حال کو بھی نہایت غم انگیز طریقے سے پیش کیا ہے۔

زیر مطالعہ ناول میں پاکستان سے ہندوستان جانے والے ایک قافلے کا ذکر ہے۔ یہ قافلہ کوئی تیس چالیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ بیج ناتھ جگہ جگہ گھات لگائے بیٹھے حملہ وروں سے بچ کر اس مہاجر قافلے میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ قافلہ راستے بھر جاں سوز مسائل سے دو چار ہوتا ہے۔ راستے میں جگہ جگہ اس قافلے پر جان لیوا حملے ہوتے رہے۔ مسلمان فسادی اور بلوائی کماد کے کھیت اور ریلوے لائن کے کنارے جھاڑیوں میں گھات لگا کر کسی قافلے کے گزرنے کا انتظار کرتے ہیں۔

یہ قافلہ جنگل کی ایک پگڈنڈی سے گزر رہا تھا۔ فسادیوں کا ایک گروہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ کسی قافلے کے آنے کی بھنک ملتے ہی مسلمان فسادیوں کے ایک سرغنہ نے حملے کا اشارہ کیا۔ بلوائیوں اور حملہ وروں نے تلوار، بلم، گنڈاسا، چھوری اور لاٹھی وغیرہ سے اس بے یارو مددگار قافلے پر دھاوا بول دیا۔ حملہ نہایت شدید تھا۔ قافلے میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ ہر طرف چیخ و پکار اٹھنے لگی۔ تھوڑے ہی دیر میں سیکڑوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ انسانی خون سے وہاں کی زمین سرخ ہوگئی۔ اس حملے کا خوف ناک منظر ملاحظہ ہو:

> ''قافلے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ جس کے جدھر سینگ سمائے ادھر اپنی جان لیے بھاگا۔ مدافعت کا یہاں کس کو ہوش تھا۔ مدافعت کی ساری امیدیں ان کے دل سے نکل چکی تھیں۔ اب تو وہ ایک اتفاق پر تکیہ لگائے، ایک امید پر جیتے ہوئے چل رہے تھے کہ کسی طرح راوی کے پل تک پہنچ جائیں ورنہ اخلاقی طور پر ان میں سے ہر شخص مرا ہوا تھا۔ اس لیے سیکڑوں آدمی آدھ گھنٹہ میں گاجر مولی کی طرح کانٹ کر پھینک دیے گئے۔ اور پھر حملہ وروں کا ہجوم اپنا کام کر کے کسی دوسری سمت کو چل دیا۔''

(ایضاً، ص:۵۳)

کرشن چندر نے فسادات اور قتل وخون کے کئی کئی روپ پیش کیے ہیں۔ یہ کسی ملک کی تقسیم نہ تھی بلکہ ایک قیامت تھی۔ ظلم کی انتہا تھی۔ بربریت کی شدت تھی۔ ایسی بربریت کہ موت بھی شرمندہ ہو جائے۔ راستے میں جگہ جگہ انسانی لاشوں کے ٹکڑے پڑے رہتے تھے۔ کہیں کٹا ہوا سر تو کہیں کٹا ہوا بازو۔ بیج ناتھ راستے بھر اس طرح کے دل خراش مناظر دیکھتا ہے۔ ایسی سنسان راہوں میں موت کتنی بھیانک ہوتی ہوگی، جب کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہو۔ بیج ناتھ ایک ایسے ہی خوف ناک منظر کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''آگے چل کر راستہ اور کشادہ ہو گیا۔ اور ایک بڑی اور پکی سڑک سے جا کے مل گیا۔ کوئی قافلہ شاید ادھر سے گزرا تھا۔ کیوں کہ ایک جگہ ایک بانہہ کٹی پڑی تھی۔ صرف ایک بانہہ۔ باقی جسم غائب تھا۔ نہ دھڑ نہ سر، نہ ٹانگ نہ پاؤں، نہ چہرہ نہ کمر۔ صرف ایک بانہہ راستہ میں پڑی

تھی۔اوراس کی ہتھیلی آسمان کی طرف کھلی تھی۔''

(ایضاً،ص:۶۳)

درج بالا عبارت سے انسانیت کی شکست خوردگی اور انتہائی بے بسی ولا چاری آشکارا ہے۔ان فسادات اورخون ریزی کے علاوہ ہجرت نے دوسرے مسائل بھی پیدا کیے۔ہجرت کے دوران یہ قافلے طرح طرح کے جاں سوز اور غیر انسانی حالات و واقعات سے دوچار ہوئے۔بھوک پیاس اور جنسی تشدد کے واقعات بھی رونما ہوئے۔عورتیں ہوس زدگی کا شکار ہوئیں۔بچوں نے بھوک پیاس سے دم توڑا۔لوگ موت سے اس قدر خوف زدہ رہتے کہ انھیں عزت وعفت کی زیادہ پرواہ نہ تھی۔بے حسی کے عالم میں ایسا ہونا ایک فطری بات ہے۔

اس کشمکش اور افراتفری کے عالم میں غیر تو غیر اپنوں نے بھی وفا نہ کی۔مہاجرین کے اس قافلے میں بچے ،بوڑھے اور نوجوان ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ایک سکھ نوجوان قافلے میں شامل جمنا نامی لڑکی کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے۔اس کا باپ چلاتا رہا''ہائے میری لڑکی ......جمنا......جمنا......''لیکن وہ جمنا کو اپنی بازوؤں میں اٹھا کر کماد کے کھیت میں گھس جاتا ہے۔مزید حیرت وافسوس کی بات ہے کہ ایسے المناک ماحول میں انسان کے اندر جنسی جذبے کی تسکین کا خیال کیوں کر اور کیسے آسکتا ہے؟ کرشن چندر نے ان واقعات وحادثات کے ذریعہ انتہائی درجے کی حیوانیت ودرندگی کو پیش کیا ہے۔

ہندوستان جانے والا یہ قافلہ اپنی منزل کی جانب تیزی سے رواں دواں تھا۔ندی اب قریب تر تھی۔راوی کا پل بھی اب واضح طور پر نظر آنے لگا تھا۔سب کے چہروں پر عجب سی چمک تھی۔دل میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔پل کی دونوں جانب ہندوؤں اور مسلمانوں کے قافلے لوٹے جارہے تھے۔حفاظتی دستے صرف پل پر لگائے گئے تھے۔اس دستے کا کمان ایک انگریز افسر کے ہاتھ میں تھا۔

حملے کے ڈر سے بیج ناتھ نے پل سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔وہ راوی ندی کو تیر کر ہندوستان پہنچتا ہے۔رومی بھی اس کے ساتھ ندی میں چھلانگ لگاتی ہے۔لیکن پانی کی تیز لہروں میں وہ غرق ہو جاتی ہے۔رومی کی موت انسان کی حیوانیت، درندگی اور بربریت کے خلاف شدید ترین احتجاج ہے۔رومی کی موت پر بیج ناتھ کی زبان سے ادا ہونے والے فکر انگیز اور غم ناک باتیں ملاحظہ ہوں:

''تجھی کو مرنا تھا رومی؟ تجھی کو میرا ساتھ دینا تھا؟ جب سب ساتھ چھوڑ گئے۔جب ملک نے ساتھ چھوڑ دیا۔اور زمین نے اور گلی نے اور خاندان نے اور گھر والوں نے اور دوست احباب نے جب اس دھرتی نے بھی اپنا ساتھ چھوڑ دیا جس کے ساتھ ہزاروں برسوں سے ہم نے محبت کا عہد و پیمان باندھا تھا۔تو کیا تیری ایسی حقیر کتیا ہی نے میرا

ساتھ دینا تھا؟ یہ دکھانے کے لیے یہ جتانے کے لیے انسان کو کہ قدرت آج بھی اپنے دل میں محبت رکھتی ہے۔ اور فطرت آج بھی الفت اور مہر و وفا کا سبق سکھاتی ہے۔ بے وقوف انجان احمق کتیا، کس لیے تو نے اپنی جان ختم کر دی۔ کس لیے تو نے اس حقیر انسان کے لیے اپنے بچوں کی قربانی دے دی جو آج اپنے مقصد سے ہٹ چکا ہے اور ظلم و ستم کے لہو سے اپنے مستقبل کو داغدار کر رہا ہے۔''

(ایضاً، ص:۸۰)

اس اقتباس کے پس پردہ ناول نگار نے انسان کے ذریعہ کی گئی اس بربریت اور خون آشام واقعات پر اپنے طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ اس کے علاوہ اس اقتباس میں انسانی بھائی چارگی، مذہبی رواداری اور امن و آشتی کے چراغ بھی روشن ہیں۔ کسی جانب داری اور تعصب سے قطع نظر کرشن چندر نے صالح انسانی قدروں کی پاسداری کی ہے

واضح رہے کہ اس ناول میں پاکستان سے ہندوستان جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے'' شرنارتھی'' اور ہندوستان سے پاکستان پہنچنے والے مسلمانوں کے لیے'' مہاجر'' لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اتفاق سے ایک شرنارتھی کیمپ میں اس کا لٹا پٹا خاندان مل جاتا ہے۔ لیکن اس کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی بہن سروج اغوا کر لی گئی تھی۔ اس حادثے سے اسے مزید صدمہ پہنچتا ہے۔ وہ بے حد جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے نکل پڑتا ہے۔ جب وہ ایک مسلمان بڑھے کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اپنا بڑھا باپ یاد آ جاتا ہے۔ اسے باپ کی شفقت یاد آ جاتی ہے۔ وہ شدید کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ بیج ناتھ کی اس حرکت سے دوسرے ہندو بلوائی اسے'' غدار'' کہتے ہوئے اس بڑھے کا سینہ چاک کر دیتے ہیں۔ یہ دردناک واقعہ بیج ناتھ کی زبانی ملاحظہ ہو:

''میں نیزہ اٹھائے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر شکار کی تلاش میں پھرتا تھا۔ میرے سامنے ایک بڑھا مسلمان ایک چھوٹے سے بچے کو گلے سے چمٹائے بھاگا جا رہا تھا۔ بچہ خوف سے چیخ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس مسلمان کو ٹھوکر لگا اور اس کی پوٹلی زمین پر گر گئی۔ اور جب وہ اسے اٹھانے کے لیے مڑا تو میں نے تیزی سے گھوڑا دوڑا کر نیزہ اس کے سینے پر رکھ دیا..... اس نے میری طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ کر اپنے ہاتھ کو انکار کے انداز میں ذرا سا ہلاتے ہوئے کہا:

'ناں! ناں!! بیٹا ناں۔ مجھے نہ مار...!'

اس بڑھے کا منہ خوف سے کھلا ہوا تھا۔ اور اوپر اٹھا ہوا ہاتھ ڈر اور التجا سے لرز رہا تھا۔ اور جہاں

پر میرا نیزہ اس کے سینے سے لگا تھا۔ وہاں سفید بال تھے۔..... اور جس نرمی اور شفقت اور التجا سے اس نے مجھ سے کہا.. نہ.. نہ بیٹا مجھے نہ مار۔! اس لہجہ سے بھی مجھے اپنا باپ یاد آ گیا۔ اور یکا یک میری آنکھوں میں آنسو سے چبھنے لگے۔ اور نیزہ اس کے سینے سے ہٹانے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی۔

'او کتے باہمن تو کیا لڑے گا۔ پرے ہٹ جا غدار!' اور یہ کہتے ہوئے بلوا پنی سیاہ گھوڑی پر سوار سرپٹ آگے آیا اور بلم سے اس بڈھے مسلمان کا سینہ چیرتے ہوئے آگے چلا گیا....''

(ایضاً،ص:۱۰۹-۱۰۸)

ہجرت اور فسادات کے اس سیلاب میں انسانیت بلکتی اور سسکتی رہی۔ لوگ تڑپ تڑپ کر دم توڑتے رہے۔ بزرگوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ درج بالا اقتباس سے ایک لاچار اور بے بس بزرگ انسان کی نالہ وفریاد اور اس کی بے رحم موت مترشح ہے۔

دراصل یہ ناول فرقہ واریت اور اشتعال انگیزی کی کئی پرتیں کھولتا ہے۔ اس ناول میں فسادات کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔ یہاں انسانی لاشوں کا انبار نظر آتا ہے۔ ہر طرف چیخ پکار اور آہو بکا کی فضا ملتی ہے۔ سرحد کے پاس ڈکی نام کا ایک کھلا میدان تھا۔ یہاں پر بے شمار لوگ گاجر مولی کی طرح کاٹے گئے تھے۔ چاروں طرف کٹی لاشوں کا ڈھیر تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورت ہر طرح کے لوگ یہاں قتل کیے گئے تھے۔ اس میدان میں پہنچتے ہی بیج ناتھ بدحواس ہو جاتا ہے۔ اس کا وجود کانپ اٹھتا ہے۔ وہ اس دردناک اور ڈراونے منظر کچھ اس انداز میں بیان کرتا ہے:

''میری چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں۔ بڈھوں کی لاشیں ، جوانوں کی لاشیں، عورتوں کی لاشیں، بچوں کی لاشیں، اوندھی لاشیں، سیدھی لاشیں، اکڑوں لاشیں، لاشیں جن کے دھڑ ننگے تھے، لاشیں جن کے ہاتھ اکڑے ہوئے تھے، لاشیں جن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لاشیں جن کی آنکھیں بند تھیں، لاشیں جن کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی، لاشیں جو زندگی کا زہر پی گئی تھیں۔ اور اب ہمیشہ کے لیے سو رہی تھیں۔''

(ایضاً،ص:۱۱۳)

اس اقتباس کا حرف بہ حرف ہجرت کے جلو میں ہونے والی خون ریزی اور بربریت کو نمایاں کرتا ہے۔ ''غدار'' ہجرت اور فسادات کے موضوع پر لکھا گیا کرشن چندر کا نمائندہ ناول ہے۔ کرشن چندر نے تقسیم اور ہجرت کے دوران رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو غیر جانب دارانہ طور پر پیش کیا ہے۔

اس ناول میں کسی سیاسی نظریے یا کسی مکتبہ فکر کا دخل نہیں ہے۔ بلکہ ناول نگار نے آفاقی اور انسانی قدروں کے تناظر میں ان المناک مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ یہی اس ناول کی انفرادیت ہے۔ دراصل یہ ناول فرقہ واریت کے سیلاب، ہجرت اور قتل و غارت گری کے کریہہ مسائل کو مرکزیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس ناول کا اختتام بھائی چارگی اور انسانیت کے پیغام کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ فرقہ وارانہ فسادات کے ذکر کے پس پردہ انسان کے دل میں محبت، اخوت اور امن و آشتی کی شمع روشن کرنا چاہتے ہیں۔

فرقہ واریت کے اس طوفان میں خواتین و بے گناہ عورتوں کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا گیا۔ ان کے پاک دامن کو داغدار کیا گیا۔ ان کی عزت وعفت سے کھیلا گیا۔ ہوس زدگی کی یہ گھنونی حرکت ہر مذہب وملت کے ماننے والوں کے ساتھ کی گئی۔ سب کی بہو بیٹیوں کی عزت وعفت لوٹی گئی۔ افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ یہ تقسیم کیوں اور کس کے لیے تھی؟ عورتوں کی بے حرمتی اور بے عزتی کی ایک دل سوز اور دردناک منظر دیکھیے۔ بیج ناتھ نے بھیڑ میں کھڑے ایک شخص سے پوچھا:

''یہاں کیا راشن ملتا ہے؟''

وہ نوجوان ہنس کر بولا۔''ہاں یہاں sex (سیکس) کا راشن ملتا ہے۔''

''کیا مطلب''

وہ بولا۔''ایک مسلمان لڑکی ہتھے چڑھی ہے۔ ہم لوگ اس کی بے عزتی کر رہے ہیں۔''

میں نے سامنے کے کیُو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا۔ مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اور آ کے کھڑے ہو گئے۔

''یہ کیُو کب تک رہے گا؟'' میں نے اسی نوجوان سے پوچھا۔

''جب تک وہ لڑکی مر نہیں جاتی۔!'' نوجوان نے جواب دیا۔''

(ایضاً،ص:۸۶-۸۵)

مذکورہ بالا مکالموں کے ایک ایک لفظ سے فرقہ واریت، نفرت، دشمنی، وحشی پن اور جبر و تشدد کی بو آ رہی ہے۔ اس ناول میں مہاجروں کی زندگی کی تلخی وکڑواہٹ، مہاجر کیمپ کی افراتفری، بھوک و بے بسی جیسے حالات و واقعات کی ایک جیتی جاگتی دنیا آباد ہے۔ اس طرح بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر کا ناول ''غدار''، تقسیم کے ناسازگار ماحول میں پیدہ شدہ فرقہ واریت کی منھ بولتی تصویریں پیش کرتا ہے۔

☆☆

اردو افسانے میں تقسیم کا کرب

تقسیم ہند برصغیر کی تاریخ کا ایک المناک حادثہ ہے۔تقسیم کے نتیجے میں ملک مختلف جاں سوز مسائل سے گھر گیا۔سرحد کی دونوں جانب بے گناہ لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔انسانیت سسکنے لگی۔سماجی،معاشرتی،تہذیبی اوراخلاقی اقدارحیات دم توڑنے لگے۔بربریت اورحیوانیت کا ننگا ناچ جاری رہا۔آپسی خلوص ومحبت، بھائی چارگی،مذہبی رواداری اورفرقہ وارانہ یگانگت کا تصوراک آن میں ٹوٹ گیا۔انسانی رشتے ناطےاورسماجی ڈھانچے کی نئی نئی تعبیریں شروع ہوئیں۔بقول ساؔحرلدھیانوی ؎

زمیں نے خون اگلا ، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے توانسانوں پہ کیا گزری

تقسیم کے اس المیے نے انسانی زندگی کے ہر ہر پہلوکو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔زبان وادب پر بھی اس قیامت کا گہرا نقش ثبت ہوا۔اردو زبان وادب بالخصوص اردو فکشن کی ایک لمبی تاریخ تقسیم وہجرت کی نذر ہو گئی۔تقسیم وہجرت کے مسائل اتنی شدت اور اتنے وسیع پیمانے پرموضوع بحث رہے کہ اب فکشن میں اس کی حیثیت دیو مالائی کردار کی سی ہوگئی ہے۔اردو ناول کے پہلو بہ پہلواردوافسانے میں بھی بٹوارےاورجلاوطنی کی چیرہ دستیوں کوشدت سے بیان کیا گیا۔اردوافسانہ ایک طویل عرصے تک ہجرت اورتقسیم کی بربریت وہولن کی کو بےنقاب کرتا رہا۔ہجرت کے خارجی مسائل کےعلاوہ داخلی کیفیات سےبھی اردوافسانہ روشناس ہوا۔

اردو افسانہ نگاروں نے اپنے بے باک قلم کے ذریعہ تمام تر غیر صحت مند افکارونظریات اورحرکات و

سکنات پر قدغن لگانے کی بھر پور کوشش کی۔ تقسیم و ہجرت کے رنج والم اور درد وغم کو افسانے کا روپ دینے والوں میں منٹو، بیدی ،کرشن چندر ، عصمت، قدرت اللہ شہاب، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جوگندر پال وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

ان میں سے بعض فن کاروں نے ہجرت کے جلو میں رونما ہونے والے مذہبی تشدد، فرقہ وارانہ فسادات، عورتوں کی آبروریزی و اغوا، بے گناہ بچوں اور بزرگوں کا قتل، جائداد کی لوٹ کھسوٹ اور بھوک و درماندگی جیسے خارجی مسائل کی عکاسی کی تو بعض نے انسان کی داخلی اور نفسیاتی کشمکش، احساس محرومی، شکست خوردگی، جذباتی وابستگی، حزن وملال، ماضی پرستی اور اپنی جڑوں سے کٹنے کے شدید احساس و پیچیدگی کو ایک نئے تیور کے ساتھ پیش کیا۔ ہر قلم کار نے اپنے افسانے کے تانے بانے میں ہجرت کے فکری و عملی رویے اور اس کے کرب و اضطراب کو سفاک حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو اردو افسانے کا نا قابل فراموش نام ہے۔ منٹو قلم کے سرجن ہیں۔ وہ اپنے قلم سے سماج و معاشرے کے ناسور کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کی نظر معاشرے کے غیر صحت مند عناصر پر ٹکی رہتی ہے۔ دراصل منٹو کی آنکھ اس کبوتر کی آنکھ سے بھی تیز تر ہے جو مرے ہوئے بیل کی کھر میں پھنسے ہوئے سرسوں کے دانے کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ منٹو بذات خود تقسیم و ہجرت کے کرب و اضطراب کا شکار ہوئے۔ انھوں نے بٹوارے اور نقل مکانی کے پس منظر میں کئی اہم ترین افسانے تخلیق کیے ہیں۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''کھول دو''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''موذیل'' اور ''سہائے'' وغیرہ میں اس مخصوص عہد کی ہولناکی اور رنج والم کو شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ہجرت کے پس منظر میں لکھا گیا لازوال اور شاہکار افسانہ ہے۔ دراصل یہ افسانہ تقسیم اور ہجرت کے خلاف شدید ترین احتجاج کا اظہار ہے۔ اس میں غیر فطری نقل مکانی کی ہنگامہ آرائی اور درد وغم کو نفسیاتی چیلنج کے بطور پیش کیا گیا ہے۔ منٹو نے بشن سنگھ نامی پاگل کردار کے ذریعہ ہجرت کی تباہی اور بربریت کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اس کردار کی ذہنی کشمکش کے آئینے میں ہجرت کی افراتفری اور بے بسی کی کیفیت کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ اس لافانی کردار کے توسط سے منٹو نے یہ تاثر پیش کرنے کی سعی کی ہے کہ پاگل تک اس صورت حال سے اس قدر پریشان اور حیران تھے تو ایک عام انسان کی کیا حالت رہی ہوگی۔ بقول منیر جہاں ؎

وطن میں اجنبی باہر مہاجر
پلٹ جانے کا بھی رستہ نہیں ہے

لاہور کے پاگل خانے میں تبادلے کی خبر پہنچتے ہی عجیب وغریب صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ جب بشن سنگھ کو اس بات کی خبر ہوتی ہے کہ اسے ہندستان بھیجا جا رہا ہے تو وہ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسے اپنا

آبائی وطن ٹوبہ ٹیک سنگھ کے چھوٹنے کا مزید صدمہ ہوتا ہے۔وہ بے حد جذباتی انداز میں اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔آخر کار وہ اس فیصلے کے خلاف ایک بے نام زمین پر دم توڑ دیتا ہے۔اس کی موت ایک عام انسان کی موت نہیں ہے بلکہ سیاسی جبر اور مفاد پرستی کے خلاف ایک گہرا اور شدید طنز ہے:

''سورج نکلنے سے پہلے ساکت وصامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی......اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا،اوندھے منھ لیٹا تھا۔ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا......ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔''

(منٹو کے نمائندہ افسانے،مرتبہ اطہر پرویز،ص:۲۳۲)

اس اقتباس کا ایک ایک لفظ چیخ چیخ کر ہجرت کے درد وغم کو بیان کر رہا ہے۔اس افسانے کا اہم موضوع ہجرت کا غیر فطری تبادلہ ہے جسے پاگل بھی تسلیم نہیں کرتے۔''کھول دو'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' جیسے افسانے بھی ہجرت کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ان افسانوں میں فرقہ وارانہ فسادات اور خواتین کی آبروریزی کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ان افسانوں سے اس دور کی تلخی وکڑواہٹ کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔افسانہ ''کھول دو'' ہجرت کے منظر سے ہی شروع ہوتا ہے:

''امرت سر سے اسپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔راستے میں کئی آدمی مارے گئے۔متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔''

(ایضاً،ص:۱۷۲)

سراج الدین سکینہ کا باپ ہے۔جو ہجرت کے دوران کہیں بچھڑ جاتی ہے۔وہ اپنی بیٹی کے غم میں نڈھال ہو جاتا ہے۔لیکن بیٹی کے ملتے ہی اس کے سینے میں خوشی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔افسانے کا اختتام درد واثر میں اس طرح ڈوبا ہوا ہے کہ قاری حیرت زدہ ودم بخود رہ جاتا ہے۔افسانے کا اختتام ملاحظہ ہو:

''ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا اور اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا۔'کھڑکی کھول دو۔'

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی۔بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔بوڑھا سراج الدین خاموشی سے چلایا۔'زندہ ہے......میری بیٹی زندہ ہے۔'

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔''

(ایضاً،ص:۱۷۶)

پیش کیے گئے ان اقتباسات میں تقسیم وہجرت کے تئیں نفرت اورغم وغصہ مترشح ہے۔منٹو کے یہاں ہجرت کے المیے کی پیش کش ایک منفرد انداز میں ملتی ہے۔منٹواپنے افسانے کی بنیاد کسی نہ کسی نفسیاتی نکتے پر رکھتے ہیں۔ان کا یہی ڈھب انھیں دوسروں سے ممتاز ومنفرد بناتا ہے۔افسانہ ''شریفن'' کا قاسم، ''ٹھنڈا گوشت'' کا ایشر سنگھ اور ''موذیل'' کا کرپال کور جیسے زندہ کردار ہجرت کی چیرہ دستیوں کی شدت سے یاد دلاتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے۔''لاجونتی'' ہجرت کے موضوع پر لکھا گیا شاہکار افسانہ ہے۔یہ افسانہ ہجرت کے زیر اثر وقوع پذیر ہونے والے دردناک واقعات کو صداقت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔اس افسانے میں عورتوں کے ناگفتہ بہ حالات ومسائل کی حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔ہجرت کے دوران نہ جانے کتنی عورتیں بے گھر ہوئیں۔بے سروسامانی کے عالم میں جنسی استحصال کا نشانہ بنیں۔غیر تو غیر اپنوں نے بھی انھیں لوٹا۔اس افسانے میں ایسی ہی مظلوم عورتوں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا سنائی پڑتی ہے۔یہاں لاجونتی نامی ایک عورت کی زندگی کی بدنصیبی کو بیان کیا گیا ہے جو اس مظلوم طبقے کی سچی نمائندگی کرتی ہے۔

لاجونتی ہجرت کی ہنگامی حالت میں کہیں کھو جاتی ہے۔اس کا شوہر سندرلال بے حد پریشان ہوتا ہے۔اتفاق سے وہ گھر واپس لوٹ آتی ہے۔سندرلال اسے قبول کرتا ہے لیکن اب وہ ایک دیوی کا روپ دھارن کر لیتی ہے۔سندرلال اسے ''دیوی'' کہہ کر پکارتا ہے۔وہ اسے تمام تر حقوق دیتا ہے لیکن اپنی بیوی بنانے سے انکار کر دیتا ہے۔بیدی نے یہاں پر جنسی طہارت کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ایک عورت کے لیے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ جیتے جی پتھر کی مورت بن جائے۔یہ عذاب بھی اسی تقسیم اور ہجرت کا عطا کردہ ہے:

> ''اور لاجونتی کی من کی بات من ہی میں رہی۔وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا۔وہ خوش تھی بہت خوش لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا ایکی اس طرف متوجہ ہو جائے......''

(راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ص:۷۵-۱۷۴)

قدرت اللہ شہاب کے افسانہ ''یا خدا'' کا موضوع بھی ہجرت کی آندھی میں بے سہارا عورتوں کی جنسی پامالی ہے۔افسانہ نگار نے دلشاد نامی ایک خاتون کے ذریعہ صنف نازک کی زندگی کی بدحالی اور پسماندگی کو ہجرت

کے آئینے میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔دلشاد امام علی بخش کی بیٹی ہے۔وہ مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں چمکور میں رہتی ہے۔بٹوارے اور جلاوطنی کے دوران یہ بستی بھی فرقہ واریت کی زد میں آ گئی۔مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ان میں سے کچھ پاکستان بھاگ نکلنے میں بھی کامیاب ہوئے۔امام بخش اس فساد میں مارے جاتے ہیں لیکن ان کی بیٹی دلشاد کو جیتے جی زندگی کا زہر پینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔اسے گاؤں کی ایک مسجد میں رکھا جاتا ہے۔وہ ایک لمبے وقت تک گاؤں والوں کی حیوانیت کا شکار ہوتی ہے۔ایک اقتباس دیکھیے:

> ''چمکور کی مسجد گوردواروں سے بھی زیادہ آباد ہوگئی تھی۔چمکور کے بہادر خالصے رات رات بھر دلشاد کے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کا سودا کیا کرتے۔امریک سنگھ کا باپ،امریک سنگھ کا بھائی......ایک خالصے کے بعد دوسرا خالصہ دوسرے کے بعد تیسرا خالصہ......''

(فسادات کے افسانے،مرتبہ زبیر رضوی،ص:۸۱-۲۸۰)

اسی دوران دلشاد حاملہ ہو جاتی ہے۔حمل نمایاں ہونے کے بعد اسے کسی قدر حیوانیت سے چھٹکارا ملتا ہے۔اب وہ جیسے تیسے لاہور پہنچتی ہے۔افسوس کہ اس پاک سرزمین کے نام نہاد فرزندانِ اسلام بھی اسے للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔اس کا سودا کرتے ہیں۔مملکت خداداد میں بھی اسے ذلت و رسوائی سے نجات نہ مل سکی۔آخر میں وہ کراچی کے ایک مہاجر کیمپ میں پہنچتی ہے۔وہاں بھی دلشاد جیسی نہ جانے کتنی بے بس و بے سہارا عورتوں کی سسکیاں سنائی پڑتی ہیں۔انھوں نے ہجرت کے نتیجے میں نوتشکیل شدہ پاکستانی معاشرے کی گھنونی حرکتوں کی حقیقی آئینہ داری کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ہند کے فوراً بعد ملک بری طرح فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔جان کی حفاظت کی غرض سے لوگ بدحواسی کے عالم میں ہجرت کر رہے تھے۔افراتفری کے اس عالم میں نوجوان عورتوں کا اغوا بھی جاری تھا۔یہ صورت حال سرحد کی دونوں جانب تھی۔ایسے میں ہجرت،فرقہ وارانہ فسادات اور اغوا جیسے مسائل کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔تقسیم کے موضوع پر تخلیق شدہ بیشتر افسانوں میں ایسے عناصر شعوری یا غیر شعوری طور پر ضرور ملتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہجرت اور بے سروسامانی کی حالت میں ہی انسانی بربریت اور ظلم و زیادتی کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اکثر افسانوں میں ہجرت کی کوئی نہ کوئی جھلک ضرور ملتی ہے۔اگر زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ''ہم وحشی ہیں''اوّلیت کا درجہ رکھتا ہے۔یہ مجموعہ تقسیم اور کشت وخون کے فوراً بعد ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں فسادات اور قتل و غارت کی بھیانک تصویریں ملتی ہیں۔دراصل اس مجموعے سے فرقہ واریت اور ظلم و بربریت کو بے نقاب کرنے کی روایت شروع ہوئی۔اس

رجحان کی پاسداری میں قلم کاروں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے ایسے ہی دل سوز اور دردناک حالات و واقعات سے اپنے افسانوں کے پلاٹ تشکیل دیے۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس یہ طوفان ذرا تھما۔اب زندگی کے دوسرے مسائل سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہندوپاک کے مہاجرین ایک نئے ملک اور ایک اجنبی دیار میں اپنی سماجی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی شناخت کے تئیں فکرمند تھے۔اس نو تشکیل شدہ ماحول میں اردو افسانے نے فکری وفنی سطح پر ایک نئی کروٹ لی۔اب افسانے میں پلاٹ و کہانی کا تصور ٹوٹنے لگا تھا۔سادہ بیانیہ کی جگہ علامت وابہام نے لے لی۔خارجی مسائل سے قطع نظر داخلی عناصر راہ پانے لگے۔فرد اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا۔اب اجتماعی شعور کی بجائے انفرادیت اہم ہوگئی۔

ایسے میں فطری طور پر قلم کاروں نے اپنے حسین اور پرسکون ماضی میں پناہ لی۔اپنی تہذیبی جڑوں سے کٹنے کے سبب پرانے تہذیبی اقدار ستانے لگے۔ان کی تخلیقات میں اب فطری طور پر ناسٹلجیا کی روش عام ہونے لگی۔نفسیاتی و داخلی کشمکش، احساس محرومی، افسردگی، ذہنی پیچیدگی اور شکست خوردگی نے اردو افسانے کو ایک نئے فکری جہان سے روشناس کرایا۔

اردو افسانے میں اب ایک نئی فضا پنپنے لگی۔ہم عصر فن کاروں نے خارجی کوائف کے برعکس ہجرت کی داخلی اور نفسیاتی توضیحات پیش کیں۔قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جوگندر پال اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔عجب اتفاق ہے کہ یہ تینوں فکشن نگار ہجرت کے کرب و اضطراب سے براہ راست متاثر بھی ہوئے۔ان تخلیق کاروں نے کبھی بھی ہجرت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔وہ ہمیشہ اپنی جڑوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔یہی فکری روش ان کے افسانوں میں تخلیقی اساس کا درجہ رکھتی ہے۔

ان فن کاروں کے یہاں ہجرت کے مسائل و نتائج کی روایتی اور جاں سوز و دردناک تصویریں نہیں ملتیں۔ قرۃ العین حیدر نے تا عمر اپنی خوبصورت یادوں اور تہذیبی سرمائے کا تخلیقی اظہار کیا۔''جلا وطن''''ہاؤسنگ سوسائٹی''''پت جھڑ کی آواز''''کیکٹس لینڈ''اور''برف باری سے پہلے''وغیرہ ہجرت کی ایک نئی تعبیر اور ایک نیا طرز احساس لیے ہوئے ہیں۔ان کے افسانوں میں جغرافیائی حدود کے برخلاف تہذیبی جلاوطنی کا احساس شدت سے رچا بسا ہے۔''کیکٹس لینڈ'' کی طلعت جمیل اس کی بہترین مثال ہے۔وہ نئے ماحول میں گھٹن محسوس کرتی ہے۔تہذیبی جلاوطنی کے اسی احساس کے باعث وہ اپنے وطن ہندوستان واپس لوٹ آتی ہے۔

افسانہ''جلا وطن''میں بھی ہجرت کا پہلو نمایاں ہے۔اس میں عورت کی ازلی جلاوطنی کو پیش کیا گیا ہے۔کشوری، کنول کماری اور ڈاکٹر آفتاب رائے اس افسانے کے اہم کردار ہیں۔ڈاکٹر آفتاب رائے تہذیبی جلا

وطنی کی آگ میں جھلستے ہیں جبکہ کنول کماری محبت میں ناکام ہو کر جذباتی جلا وطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔افسانے میں ہر جگہ ہجرت اور جلاوطنی کی دھند و کہر چھائی ہوئی ہے۔کشوری جلاوطنی اور حالات کی ماری ہوئی ایک ایسی ہی خاتون ہے۔وہ جلاوطنی کے عالم میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتی ہے۔اپنی بے بسی اور بے چارگی کو بیان کرتے ہوئے وہ ایک جگہ کہتی ہے:

''تم نے کبھی خیال کیا کہ میں کہاں جاؤں گی۔۔؟ میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابل رحم کردار بننے کے مستحق تھے......؟؟''

(شیشے کا گھر،قرۃ العین حیدر،ص:۳۲۶)

کشوری کا یہ سوال ہی اس افسانے کا مرکزی نکتہ ہے۔کنول کماری کی جلاوطنی کشوری سے ذرا مختلف نوعیت کی ہے۔اس کے جذبات واحساسات 'سیتا ہرن' کی میر چندانی کی یاد دلاتے ہیں۔وہ آفتاب رائے سے محبت کرتی ہے۔لیکن تنہائی وغم کے سوا اسے کچھ نہ مل سکا۔نتیجتاً وہ بے بسی اور لاچاری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے:

''لیکن سردی بڑھتی گئی اور بے کراں تنہائی اور زندگی کے اور ابدی پچھتاؤں کا ویرانہ۔آفتاب بہادر کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے؟ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہوسکتی تھی اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ نہیں سکتی۔''

(ایضاً،ص:۲۲۱)

''پت جھڑ کی آواز''اور''ہاؤسنگ سوسائٹی''وغیرہ میں بھی ایسی ہی تخلیقی فضا ملتی ہے۔ان کے یہاں مجموعی طور پر ہجرت اور جلا وطنی کے تناظر میں جاگیردارانہ تہذیب وتمدن کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا غم وصدمہ ملتا ہے۔موضوع اور کردار کی سطح پر یکسانیت کا پہلو حاوی ہے۔انھوں نے شعوری طور پر خواتین طبقے کی جلا وطنی،اخلاقی پستی اور ان کی نفسیاتی وروحانی کیفیات کو اپنے فن کے سانچے میں خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔

انتظار حسین ہجرت اور جلاوطنی کا دوسرا نام ہے۔ان کی تخلیقات کا غالب حصہ ہجرت کے کرب و اضطراب میں رنگا ہوا ہے۔ان کے یہاں تقسیم در تقسیم اور قیام بنگلہ دیش کے پس منظر میں ٹوٹتی بکھرتی تہذیب وثقافت،اپنے آبائی وطن کی مٹی کی بو باس،پرانی یادوں کی کسک اور انسانی رشتوں کی مہک وغیرہ کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ہجرت کے کرب واضطراب میں شدت پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اساطیری

اور دیومالائی کرداروں کا بھی سہارا لیا ہے۔ان کی تخلیقات میں موضوعات کی سطح پر فکری یکسانیت ملتی ہے۔

''شہرِ افسوس''، ''کشتی''، ''وہ جو کھو گئے''، ''ہندوستان سے ایک خط''، ''خواب اور تقدیر''، ''اندھی گلی''، اور ''نرناری'' وغیرہ ہجرت وجلاوطنی کے کرب ومصائب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان کے بیشتر افسانوں میں ناسٹلجیا، ماضی پرستی، اپنی تہذیبی شناخت کا غم، تہذیبی و ثقافتی تصادم، لاسمتی و گمشدگی اور لایقینی و اداسی جیسے نفسیاتی حالات و کوائف ایک نئے تیور کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔انھوں نے ہجرت کی المناکی اور داخلی کرب واضطراب کو علامتی انداز میں بھی پیش کیا ہے۔افسانہ ''وہ کھو گئے'' اس کی عمدہ مثال ہے۔اس افسانے میں ہجرت وغریب الوطنی کو مرکزیت حاصل ہے۔انتظار حسین اپنی اس ذہنی روش کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۴۹-۱۹۴۸ء کے سالوں میں جب میں اپنی چھوڑی ہوئی بستی کو یاد کر کے کہانیاں لکھ رہا تھا تو بزرگوں نے افسوس کیا کہ غریب ناسٹولجیا کا مارا ہوا ہے جیسے ناسٹولجیا کوئی مرض ہوتا ہے، مگر یادوں نے میرا جتنا علاج کیا اتنا ہی مرض بڑھتا گیا۔اپنی بستی کے دنوں کو یاد کرتے کرتے میں ان دنوں کو یاد کرنے لگا جو میری پیدائش سے پہلے جگمگاتے تھے۔اور جس کا ذکر میں نے نانی اماں سے سنا تھا۔پھر یوں ہوا کہ اس برصغیر کے ہزاروں برسوں میں مختلف کل ہمارے تصور میں رچنے لگے۔اور بھی کل ہوں گے جو میرے اندر ہیں مگر مجھے ان کا شعور نہیں۔''

(کچھوے، انتظار حسین، ص:۱۷۳-۱۷۲)

افسانہ ''شہرِ افسوس''، ہجرت کے اس المیے کو پیش کرتا ہے کہ اپنی سرزمین چھوڑنے والے کو کوئی زمین قبول نہیں کرتی۔اس میں تقسیم در تقسیم کے حوالے سے ۱۹۷۱ء کی جنگ اور قیام مشرقی پاکستان کی خونی داستان بیان کی گئی ہے۔انتظار حسین نے یہ خیال پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے باعث ایک جگہ سے اجڑا ہوا انسان کہیں اور بس نہیں سکتا کیوں کہ پناہ دینے والی زمین اس پر کبھی نہ کبھی ضرور تنگ ہوتی ہے۔بنگلہ دیش میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔امن وسکون کی تلاش میں لوگ در بدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔''شہرِ افسوس'' کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> ''دوسرا آدمی دونوں کو دیکھ کر یوں گویا ہوا اے بدشکلو! کیا میں نے تمھیں گیا کے آدمی کی بات نہیں بتائی تھی۔ہر زمین ظالم ہے اور آسمان تلے ہر چیز باطل ہے۔اور اکھڑے ہوؤں کے لیے کہیں امان نہیں ہے۔''

(گنی چنی کہانیاں، انتظار حسین، ص:۹۸)

جوگندر پال کے افسانے بھی ناسٹلجیائی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ان کے یہاں بھی انتظار حسین کی طرح

اپنے وطن اور اپنی مٹی سے الگ ہونے کا شدید غم وصدمہ ہے۔وہ زندگی کی بکھری ہوئی کرچیوں کو ماضی کے سہارے تلاش کرتے ہیں۔ان کی تخلیقی زندگی ماضی کے دریچوں سے ہی آب وہوا حاصل کرتی ہے۔دراصل ان کے افسانے ایک غمگین اور افسردہ انسان کے ٹوٹے ہوئے دل کے نہاں خانوں کی شکستہ آوازیں ہیں۔

افسانہ ''فاختائیں''اور''گرین ہاؤس'' میں اپنی تہذیبی شناخت کھونے کا شدید ملال جھلکتا ہے۔افسانہ''گرین ہاؤس'' کا ہیرو مولو سیالکوٹ سے ہجرت کر کے کینیا اور دوسرے مغربی مما لک کی شہریت حاصل کرتا ہے۔وہ کئی بار اپنی جڑوں سے اجڑتا اور بستا ہے۔ہجرت در ہجرت اس کی زندگی کا المیہ بن جاتی ہے۔وہ سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی روحانی تسکین سے محروم رہتا ہے۔ اسے بار بار اپنا وطن یاد آتا ہے۔اپنی مٹی اور اپنی تہذیب یاد آتی ہے۔اپنا گھر بار اور وہاں کا خوبصورت نظارہ یاد آتا ہے:

''لیکن مولو کے ذہن میں اپنے گھر کا تصور صرف اسی گھر سے بندھا ہوا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا...... ہمالہ کے کوہستانی سلسلے سے کچھ ہی فاصلے پر اس کے چھوٹے سے میدانی شہر سیالکوٹ میں ایک چھوٹا سا نہایت پرانا مکان، جو اتنا بڑا تھا کہ اتنے سالوں کی دوری سے بھی مولو کو ویسے ہی صاف دکھائی دیتا تھا اور اتنا پکا کہ ابھی تک اس کے دل ودماغ میں جوں کا توں کھڑا تھا۔''

(جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب،مرتبہ انیس امروہی،ص:۶۹)

اس افسانے میں جوگندر پال نے مہاجرین کی ذہنی ونفسیاتی پیچیدگی اور احساس شکست خوردگی کو تخلیقی حسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔'فاختائیں' بھی اسی نوعیت کا افسانہ ہے۔اس میں پرائمری کے ایک استاذ لوبھ سنگھ کی کہانی بیان کی گئی ہے۔وہ تقسیم کے زیر اثر بپا ہونے والے قتل وخون اور ہنگامے سے خوف زدہ ہو کر دہلی ہجرت کر جاتا ہے۔لیکن ایک لمبے عرصے کے بعد بھی اسے وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی۔وہ اپنے پاکستان کے دوست احباب سے خط وکتابت بھی جاری رکھتا ہے۔یہ جذباتی وابستگی اسے ذہنی طور پر کچوکے لگاتی رہی۔افسانہ نگار نے اس کی تمام تر نفسیاتی کشمکش اور ذہنی پیچیدگی کو تخلیقی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو افسانے کی ایک لمبی روایت تقسیم وہجرت کے کرب والمیے کو دیانت داری کے ساتھ پیش کرتی ہے۔خارجی حالات ومسائل کے پہلو بہ پہلو داخلی کوائف بھی اردو افسانے میں پیوست ہو گئے ہیں۔

☆☆

ناز قادری کی افسانوی کائنات

مختصر افسانہ، اردو غزل کی مانند نہایت سخت جان صنف ادب ہے۔ یہ صنف مختلف النوع فکری وفنی تجربات ومشاہدات سے نبرد آزما ہوتی رہی ہے۔کبھی اسے افکار ونظریات کی بھٹی میں تپا کر کندن بنایا گیا تو کبھی یہ صنف لفظ واسلوب کی ساحری میں گرفتار رہی۔کبھی اس میں قصہ پن اور پلاٹ کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا تو کبھی رمز وابہام کی کیفیت کو لازمی سمجھا گیا۔اتنے رنگ وروپ بدلنے کے بعد بھی مختصر افسانے کی کشش ودلکشی برقرار رہی۔ایسی تمام تر مصلحت اور ازم سے قطع نظر بعض فن کاروں نے اپنی ایک الگ تخلیقی دنیا آباد کی ہے۔ناز قادری ایک ایسے ہی فن کار ہیں۔ناز قادری کے افسانے ان کی فکری وفنی انفرادیت کی چغلی کھاتے ہیں۔ ان کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''وہ ایک بات'' ان نکات کا بھرپور جواز رکھتا ہے۔

یہ دنیا نظریات وتصورات اور تجربات ومشاہدات کی آماجگاہ ہے۔ادیب معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے بے شمار تجربات ومشاہدات سے گزرتا ہے۔ وہ ہر لمحہ نت نئے جذبات واحساسات سے دوچار ہوتا ہے۔اس کے علاوہ وہ دنیا کے ہزار ہا مسائل سے آنکھ ملاتا ہے۔ایسے میں ایک ادیب وفن کار کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی جذبے وخیال یا کسی مسئلے ونظریے کو اپنے فن پارے میں پیش کرے۔

یہ آزادی ادب کے لیے آکسیجن کا کام کرتی ہے۔اس سے ادب میں فکر ونظر کے نئے نئے دریچے وا ہوتے ہیں۔ان دریچوں سے نئی روشنی اور ہوا کے تازہ جھونکے آتے ہیں۔فن کار کی ذاتی ذمہ داری ہے کہ وہ اس امر کا پاس رکھتے ہوئے کسی بھی طرح کی فکری پابندی سے آزاد رہے کیوں کہ فکر وذہن پر لگائے گئے پہرے اکثر

ادب پارے کو یک رخا بنا دیتے ہیں۔ ناز قادری ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے کھلی فضاؤں میں سانس لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ کوئی فن کار کسی خیال یا کسی جذبے کو کتنی گہرائی اور کتنی شدت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر پیش کرتا ہے۔ یہ بات اس کی ادبی وتخلیقی شان کو آشکارا کرتی ہے۔ ناز قادری کی افسانوی فضا، حسن وعشق اور داخلی جذبات واحساسات میں نمو پاتی ہے۔ ان کی تخلیقی فکر وآگہی کی دنیا میں پھیلاؤ نہیں ملتا۔ عشق ومحبت کے نازک ترین احساسات وجذبات ہی ان کی کل کائنات ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' کے مصداق آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہی خوبی قاری کو ان کے افسانے پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ناز قادری کے افسانوں کے تانے بانے حسین اور خوبصورت یادوں کے سہارے بنے گئے ہیں جن میں درد وکسک بھی ہے اور کچھ کھونے کا شدید احساس بھی۔ ان کے یہاں وصال سے زیادہ ہجر وفراق کا تصور ابھرتا ہے، خوشی اور شادمانی کی بہ نسبت غم وملال کا احساس ہے۔ لیکن یہ غم واداسی قاری کو احساس محرومی میں مبتلا نہیں کرتے بلکہ اعلیٰ ظرفی اور نیک وصالح انسانی قدروں سے ہم کنار کرتے ہیں۔

''پلکوں میں آنسو''، ''درد کب ٹھہرے گا''، ''یہ نہ تھی ہماری قسمت''، ''تشنگی کا سفر''، ''خوشبو تیری وفا کی'' اور ''یادوں کے دریچے'' جیسے افسانے قاری کے دل میں خوشی وشادمانی اور غم ومایوسی کی ملی جلی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے دل میں یادوں، خوشیوں اور تمناؤں کے صدہا چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ افسانوں کی رومان انگیز فضا مثبت ونیک جذبات پیدا کرتی ہے۔

افسانوں میں ارمانوں اور تمناؤں کے ٹوٹنے بکھرنے کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن ان بکھری ہوئی کرچیوں میں بھی ایک نوع کا روحانی لمس موجود ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں ایک جیسی تخلیقی فضا اور ایک جیسے مسائل ملتے ہیں۔ موضوعات کی یکسانیت کے باوجود ان کے افسانے نئے پن اور جدت کا احساس دلاتے ہیں۔ ناز قادری کے افسانوں کے کردار حسن وخوبصورتی کے دل دادہ نظر آتے ہیں۔ کوئی خوبصورت شے ان کے دل کے تار کو چھیڑنے لگتی ہے۔

ان کے بیشتر کہانیوں میں واحد متکلم صیغہ ''میں'' کا استعمال ہوا ہے۔ ان کے خوبصورت افسانہ ''تشنگی کا سفر'' میں سدھا کا کردار نہایت جاندار اور دلکش ہے۔ اس افسانے میں یونیورسٹی کی جانی پہچانی فضا پیدا کی گئی ہے۔ سُدھا سائیکلوجی کی نئی استانی ہے۔ وہ بے حد حسین وجمیل ہے۔ یونیورسٹی میں جیسے ہی اس کی آمد ہوتی ہے گویا ویرانے میں بہار آجاتی ہے۔

افسانہ نگار نے اس کے ظاہری خدوخال کو ابھارنے میں اپنی فن کارانہ صلاحیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ سُدھا کردار ''میں'' کے اعصاب پر بری طرح چھا جاتی ہے۔ کردار ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کی کہانیاں لکھنے کی ساری صلاحیت چھین لی گئی ہو۔ بلکہ افسانے میں ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ ''اب تو کوئی کہانی ہی جنم نہیں لیتی! شاید میں خود کہانی بنتا جا رہا ہوں''۔ وہ ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

''جب بھی کاغذ قلم لے کر کہانی لکھنے بیٹھتا ہوں سُدھا میرے قریب آ جاتی ہے، بہت قریب اور کاغذ قلم چھین کر ایک طرف رکھ دیتی ہے اور اس کی جھیل سی گہری خُمار آلود آنکھیں کہنے لگتی ہیں: آپ کو صرف افسانے سے دلچسپی ہے! آپ کو میرے وجود میں کوئی کشش نظر نہیں آتی...! اور وہ اپنی مرمریں بانہیں میرے گردن میں ڈال دیتی ہے۔''

(تشنگی کا سفر)

اسے سدھا حسن کی دیوی لگتی ہے۔ اسے اس کے تراشیدہ یاقوتی ہونٹوں پر مونالیزا کے تبسم کا نور نظر آتا ہے۔ اور اس کی مخمور آنکھوں میں عمر خیام کی رباعیاں مچلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ اس کے لباس میں حسن و جوانی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ افسانہ نگار نے موضوع کی مناسبت سے تکنیک استعمال کی ہے۔ جگہ جگہ تلازمہ خیال اور Dramatic Monologue کا انداز در آیا ہے۔ سدھا کے خیال محض سے اس کے سینے میں جذبات و احساسات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ اس کے دل میں ایک طوفان موجزن ہو جاتا ہے۔ سدھا کے متعلق اس کی تصوراتی دنیا کی جھلک کچھ اس طرح پیش کی گئی ہے:

''وہ جب تک ادب پر گل افشانی کرتی ہے، میں اس کے دل آویز لہجے، جاذبِ نظر خدوخال اور آواز کے جادو میں کھویا رہتا ہوں اور میری نگاہیں اس کے حسن و جمال کو چومتی رہتی ہیں۔ میں اس کے وجود کے نشہ میں ڈوبتا چلا جاتا ہوں اور تصور ہی میں اسے اپنی بانھوں میں لے کر ایسی کائنات میں پہنچ جاتا ہوں جہاں کوئی نہیں ہوتا، میں ہوتا ہوں اور سُدھا ہوتی ہے۔ اس کے حسن و جمال کی چاندنی ہوتی ہے اور اس کی پیاری پیاری باتیں ہیں، شہد میں ڈوبی ہوئی باتیں''

(تشنگی کا سفر)

ان کے تمام افسانے ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۴ء کے درمیان تخلیق کیے گئے ہیں۔ افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ آج کی اس پر پیچ اور پیچیدہ زندگی میں تصوراتی تخلیقی اساس کیوں کر اور کیسے وجود میں آ سکتی ہے۔ ان سوالات کا پیدا ہونا فطری ہے۔ اس کا ایک جواز یہ ہو سکتا ہے کہ ماضی کے

حسین اور یادگار لمحات ہی وہ سہارا ہوتے ہیں جہاں انسان کو دو پل کے لیے ہی سہی سکون اور روحانی تسکین میسر ہوتی ہیں۔

یہ یادیں انسان کی اپنی ہوتی ہیں۔اس تصوراتی جہاں میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔اس طرح واضح رہے کہ خوبصورت ارمان، نیک آرزوئیں اور پر بہار حسرتیں خوابناک یادوں کی شکل میں ان کے افسانوں کے لیے تخلیقی اساس فراہم کرتے ہیں۔ ماضی پرستی اور ناسٹلجیا کی یہی فضا الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر افسانے کا روپ دھارن کرتی ہے۔ان کے اکثر و بیشتر افسانے اس امر کا بین ثبوت ہیں۔

ناز قادری کے یہاں محبت والفت کے پیمانے روایتی ڈگر سے ذرا مختلف ہیں۔مطلب یہ کہ ان کی تخلیقات سے محبت کی راہ میں کچھ پانے سے زیادہ کھونے کی ترغیب ملتی ہے۔ان کے افسانوں کے ہیرو محبت میں ناکام و نامراد نظر آتے ہیں۔قاری پہلی نظر میں اسے مایوسی اور محرومی سمجھتا ہے لیکن ذرا بعد کو وہ محبت کی اصل روح سے آشنا ہوتا ہے۔کیوں کہ سچی محبت تو قربانی اور خلوص کا نام ہے۔یعنی ناز قادری اپنے افسانوں کے ذریعہ کچھ حاصل کرنے سے زیادہ کھونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ان کے کردار اسی قربانی اور خلوص کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔

افسانہ ''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں'' اور ''درد کب ٹھہرے گا'' میں محبت کی ایسی ہی مثالیں ملتی ہیں۔ جاوید ''درد کب ٹھہرے گا'' کا مرکزی کردار ہے۔افسانے کی ہیروئن بانو سے شناسائی ہونے کے بعد اس کی اجاڑ زندگی میں خوشی کے پھول کھل جاتے ہیں ۔اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ''دل کے خزاں رسیدہ چمن میں بہار آگئی ہے،سرور و انبساط کے غنچے چٹکنے لگے مسرت و شادمانی کی کلیاں مسکرانے لگی ہیں۔'' بانو سے ملاقات کے بعد اس کی زندگی کی مایوسی اور محرومی امید میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی معصومیت، دلکشی اور خوبصورت آنکھوں سے کس قدر متاثر ہوتا ہے۔وہ اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''نہ جانے تمہاری ان بڑی بڑی آنکھوں میں کون سا جادو تھا جس نے میرے احساسات کو جھنجوڑا، میرے دل کو گدگدایا، میری خوابیدہ تمناؤں کو جگایا اور میری سوئی ہوئی امنگوں کو بیدار کیا۔اسی دن پہلی بار میرا دل کسی کے لیے دھڑکا تھا، میں نے پہلی بار کسی کے لیے چاہت کی شدت محسوس کی تھی۔''

(درد کب ٹھہرے گا)

وہ بانو کو اجنتا کے کسی سنگ تراش کا شاہکار، ایلورا کی جیتی جاگتی مورتی اور حسن بن صباح کی جنت کی حور کہتا ہے۔لیکن جب اسے پتہ چلتا ہے کہ بانو کسی اور کی ہے۔ وہ اس کی زندگی میں نہیں آسکتی تو اس کا شیش محل چکنا چور ہو جاتا ہے۔اس کی آرزوؤں کے شگفتہ گلاب مرجھا جاتے ہیں، حسین زندگی کے سنہرے خواب بکھر

جاتے ہیں۔اب اسے بانو کی سنجیدگی ومتانت سمجھ میں آنے لگتی ہے۔اسے بانو کی ایک ایک باتیں یاد آتی ہیں۔کبھی بانو نے اس کی کاپی پر یہ اشعار بھی لکھے تھے۔

کتنے ہی یہاں ایسے کنول ہوتے ہیں
کھلتے نہیں اور وقف اجل ہوتے ہیں
یہ بات جدا ہے کہ وہ تعمیر نہ ہوں
ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

بانو کو کھونے کے بعد اس کے دل کو شدید ٹھیس لگتی ہے لیکن وہ اپنی شخصیت اور اپنے وجود کو بکھرنے سے بچا لینے میں کامیاب ہوتا ہے۔وہ ان محرومیوں اور مایوسیوں کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔دل کی دنیا ویران ہونے کے بعد جاوید نے شادی کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔لیکن ماں کے اصرار پر اس نے شادی بھی کر لی۔شہناز اس کی زندگی میں آ کر اس کے دل کی ویرانی کو چمن زار بنا دیتی ہے۔وہ اسے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔اپنی بیوی کے پہلو میں ہوتے ہوئے بھی جاوید کو بانو کی یاد شدت سے آتی ہے لیکن وہ اس کے خلوص اور بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔

ناز قادری نے اپنے کرداروں کے حرکات واعمال اور افکار وخیالات کے توسط سے اعلیٰ انسانی قدروں کا نمونہ پیش کیا ہے۔ہاں ایک کمی ضرور کھٹکتی ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار ہمیشہ اچھائی کا پہلو ہی پیش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں تبلیغی رویّہ جھلکتا ہے۔کرداروں کے فیصلے ہمیشہ نیک صالح ہی ہوتے ہیں جبکہ فطری طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ایسی صورت حال میں بعض اوقات فلمی انداز در آیا ہے۔افسانوں میں کہیں کہیں منطقی اور تجزیاتی جواز کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔

ان کے کردار اکثر یک طرفہ محبت میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ان کی ناکامی و نامرادی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔مثلاً ''درد کب ٹھہرے گا'' کا جاوید بانو کو ٹوٹ کر چاہتا ہے۔لیکن وہ کبھی اظہار محبت نہ کر سکا۔اس کے مطابق ''میں اپنی خاموش محبت کی دھیمی دھیمی آنچ میں گیلی لکڑی کی طرح سلگتا رہا'' اچانک ایک دن اس کی بھابھی نے بتایا کہ بانو کی شادی اس کے خالوزاد بھائی ڈاکٹر پرویز سے ہونے والی ہے۔یہ رشتہ بچپن سے طے ہے۔یہ سن کر جاوید مغموم اور اداس ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی کا آشیانہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ بغیر کسی جواز کے اتنی بڑی بڑی امیدیں کیسے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔کسی کی آنکھوں میں اپنے لیے چاہت کی قوس قزح کا رنگ بکھرتا محسوس کر کے کیا اتنے بڑے بڑے سپنے دیکھے جا سکتے ہیں؟ شاید جواب نفی میں ہوگا۔لہٰذا یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ افسانہ نگار نے کرداروں کے اندر کچھ زیادہ ہی معصومیت بھر دی ہے۔ان کے کردار تخیل کی دنیا میں پرواز کرتے نظر آتے ہیں۔محبت ایک آفاقی جذبہ ہے لیکن اس کے بھی کچھ

اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ بہرحال کردار ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اسی نوعیت کا ایک دوسرا افسانہ ''شیشوں کا مسیحا'' ہماری توجہ کا مرکز ہے۔ اس میں بھی نامرادی و مایوسی کی مغموم فضا ملتی ہے۔ اس کے اکثر کردار ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اس افسانے کا ہیرو فیروز شعروشاعری کا رسیا ہے۔ وہ اپنے سینے میں مچل رہے جذبات کو شعری پیکر میں ڈھالتا ہے۔ چاند نامی ایک نسوانی کردار کی آمد ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں چاند تھی۔ چاند سے فیروز کی ملاقات اس کی ماموں زاد بہن شیریں کے ذریعہ ہوتی ہے۔

افسانہ ''درد کب ٹھہرے گا'' کے جاوید کی طرح فیروز بھی چاند کے حسن و جمال کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ اس کی یاد میں وہ ہمہ وقت 'ماہی بے آب' کی مانند تڑپنے لگا۔ اسے اب ایک انوکھی خلش اور نرالی چبھن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ دل کے ساتھ اس کی شاعری کی دنیا بھی بدل جاتی ہے۔ سوز و گداز، درد وغم اور وجدانی کیفیت اس کی نظموں میں رچ بس جاتی ہے۔

فیروز کے ساتھ وہی ہوا جو جاوید کے ساتھ ہوا تھا۔ چاند کی بے پناہ محبت نے فیروز کی آنکھوں کی نیند چھین لی۔ اس کی پرسکون زندگی میں تلاطم آ گیا۔ وہ اپنی جذباتی نظموں کے ذریعہ اپنے دل اور اپنے سینے میں دفن راز کو آشکار کرتا ہے۔ چاند کی روح ایک انجانی تڑپ سے آشنا ہوتی ہے۔ اس کے دل میں بھی ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی کسی کو پکارنے لگتی ہیں۔ فیروز اپنے خواب کی شہزادی یعنی چاند کے جذبات و احساسات سے آشنا ہوتا ہے۔ اب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ''دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی''۔

لیکن یہاں بھی دونوں کی چاہت و محبت بھولے پن اور معصومیت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ دونوں خاموش محبت کی دھیمی دھیمی آنچ میں گیلی لکڑی کی طرح سلگتے رہے۔ چاند بھی اپنے دل کی بات کہنے سے قاصر رہی۔ ناز قادری نے ان افسانوں میں ایک خاص طرح کی کشش اور تڑپ سمونے کی شعوری کوشش کی ہے۔ یہ تڑپ اور کشش تہذیبی اور اخلاقی روایات کی پابند نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے کی یہی وہ خوبی ہے جو رومان انگیز اور تڑپتے ہوئے جذبات و احساسات کو بھی ایک مثبت رخ عطا کرتی ہے۔ چاند اس لیے اظہار محبت نہیں کر سکتی کہ وہ مشرقی خاتون ہے۔ جس کے سینے میں دل تو ہوتا ہے لیکن منہ میں زبان نہیں ہوتی۔ جو اپنی تمناؤں کا گلا گھونٹ سکتی ہے لیکن ان کی تکمیل کی کوشش نہیں کر سکتی۔

شعلۂ عشق دل میں فروزاں رہا
زندگی شمع کی طرح جلتی رہی

ان کے خلق کیے ہوئے کردار جذبات کی صداقت، روح کی پاکیزگی اور محبت کے تقدس کے علم بردار نظر

آتے ہیں۔ وہ اخلاقی پستی اور تہذیبی زوال کے قائل نہیں۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناز قادری کی تخلیقی دنیا جانی پہچانی ہے۔ میرؔ کی شاعری کی طرح ان کے افسانے ان کے دل کے نہاں خانوں کی شکستہ آوازیں ہیں۔ خیالات اور جذبات کی پیش کش میں کہیں کہیں اس قدر شدت پیدا ہوگئی ہے کہ کرداروں سے ہم کلام ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

اب تھوڑی سی گفتگو ناز قادری کے افسانوں کی فنی ساخت کے متعلق بھی۔ ان کے افسانے تکنیک اور انداز پیش کش کے اعتبار سے بھی ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ انھوں نے موضوعات کی مناسبت سے موزوں ترین زبان و بیان اور اسلوب استعمال کیا ہے۔ وہ کسی بھی جذبے یا احساس کو عام فہم اور دلکش پیرایۂ اظہار میں بیان کرنے کا ڈھب جانتے ہیں۔

ان کے یہاں فکر و خیال کی ترسیل کا مسئلہ افسانے اور قاری کے درمیان حائل نہیں ہے۔ وہ لطیف سے لطیف اور نازک ترین جذبے و احساس کو بڑی سادگی سے ادا کر جاتے ہیں۔ افسانے کی کامیابی اور دلکشی کی خاص وجہ ان کا پرکشش اسلوب ہے۔ البتہ کردار اور پلاٹ کی سطح پر کہیں کہیں جھول نظر آتا ہے۔ افسانہ نگار نے کردار کی شخصیت کی تشکیل اور اس کی ارتقا پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کی ہے۔ نسوانی کرداروں کے خد و خال اور ان کی ظاہری ساخت کی تصویر کشی میں افسانہ نگار نے اپنی تخلیقی جادوگری کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ناز قادری کا اچھوتا اور دلکش اسلوب انھیں رومانی افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ان کے اسلوب پر کرشن چند کے رومانی لب ولہجہ کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ کرشن چندر کے یہاں حقیقت اور تخیل کی خوبصورت آمیزش ملتی ہے۔ لیکن اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی مرحلے میں انھوں نے وادی کشمیر کے حسن و دلکشی کو اپنے فن کے سانچوں میں ڈھالا۔ ظاہر ہے کہ پرلطف و اچھوتے اسلوب اور لب ولہجہ نے کرشن چندر کو کرشن چندر بنایا۔ بعد میں انھوں نے خالص ترقی پسند افسانے بھی لکھے۔ یعنی وہ رومان کی راہ سے حقیقت پسندی کی طرف آئے۔

ٹھیک یہی حال فیض احمد فیض کا بھی تھا۔ لیکن ان دونوں نے اپنے فن کا توازن برقرار رکھا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی تخلیقات میں رومانیت کا ہلکا سا رنگ فطری طور پر جھلکتا ہے۔ ناز قادری کے افسانے صرف رومانی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے خارجی مسائل عنقا ہیں اور یہی ان کی شناخت بھی ہے۔ مطلب یہ کہ ناز قادری اگر کشمیر کی حسین وادیوں اور وہاں کے آب و ہوا میں سانس لیتے تو دوسرے کرشن چندر ضرور کہلاتے۔ ان کے افسانوں کی تخلیقی فضا کرشن چندر کے مشہور افسانہ ''پورے چاند کی رات'' کی یاد دلاتی ہے۔

انھوں نے اپنے اسلوب اور تخلیقی ڈھب میں حسن و دلکشی پیدا کرنے کے لیے خوبصورت تشبیہات

واستعارات، دلکش امیجری اور پرکشش زبان کا فن کارانہ استعمال کیا ہے۔ان کے افسانوں میں ایک نوع کا گٹھاؤ ملتا ہے۔ افسانوں کے تانے بانے ایک دوسرے سے مربوط اور پیوست ہیں۔ ایک اہم بات یہ کہ ناز قادری افسانوں کو بے جا طور پر طویل نہیں کرتے۔ ان کے افسانے مختصر اور اپنے تھیم و مرکزی موضوع سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ خوبی ان کے تمام افسانوں میں نظر آتی ہے۔ وہ موضوع کے نقطۂ نظر سے کردار گڑھتے ہیں۔ وہ آس پاس کے معاشرے سے ہی کردار اخذ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک جیتا جاگتا معاشرہ سانس لے رہا ہے۔

ناز قادری کے افسانوں کے عنوانات بھی ان کی تخلیقی جدت کی نشاندہی کرتے ہیں۔یعنی عنوانات، افسانوں کے موضوعات اور تاثرات سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ان عنوانات سے افسانے کی تخلیقی حسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ''تشنگی کا سفر'' ''درد کب ٹھہرے گا'' ''خوشبو تیری وفا کی'' ''پلکوں میں آنسو'' اور ''زندگی مسکرانے لگی'' جیسے عنوانات قاری کو پہلی نظر میں ہی کسی خاص جذبے و داخلی کیفیت کا احساس دلاتے ہیں۔ایک کامیاب کہانی کار کے بطور ناز قادری نے افسانوں میں دلکشی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ان کے افسانوں کا آغاز روایتی انداز میں نہیں ہوتا۔ ناز قادری نے یہاں بھی اپنی انفرادیت اور اچھوتے پن کی مثال پیش کی ہے۔عنوانات کی مانند افسانے کا ابتدائی جملہ بھی قاری کے اندر تجسس پیدا کرتا ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

''آج ساری کائنات چاندنی میں نہارہی ہے''

''اور تصویر اس کے ہاتھوں سے گر گئی!''

'دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب مغرب کی آغوش میں چھپ گیا''

''آج موسم کتنا خوش گوار ہے!''

''اور میری نظریں فرحت پر جم سی گئی ہیں''

افسانوں میں مستعمل تشبیہات نے ان کے اسلوب میں غضب کی دلکشی اور رنگینی پیدا کردی ہے۔ان کی زبان رنگین ہوتے ہوئے بھی ترسیل میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں بنتی۔ وہ نازک ترین احساسات، پاکیزہ جذبات اور رنگین و پرکشش انداز بیان کی آمیزش سے اچھوتی اور سحر انگیز تخلیقی فضا پیدا کردیتے ہیں۔ان کے تخلیق کردہ پر لطف تشبیہات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- اس کی خمار آلود آنکھیں دعوت سرور دے رہی ہیں اور یاقوتی ہونٹ انگارے کی طرح دہک رہے ہیں۔
- اپنی خاموش محبت کی دھیمی دھیمی آنچ میں گیلی لکڑی کی طرح سلگتا رہا۔

- سپید جسم کے تمام خطوط نکھر رہے ہیں اور وہ آئینہ کی طرح چمک رہی ہے۔
- میں اپنے کمرے میں آ کر کٹی پتنگ کی طرح گر گئی ہوں۔
- دل میں آبِ زمزم کی پاکیزہ اور گنگا جل کی مانند پوتّر محبت بڑھ رہی ہے۔
- ہم سب کے سب سوکھے پتوں کی طرح بکھر گئے۔

ان کے یہاں فضا آفرینی اور تصویر کشی کی جادوگری بھی ملتی ہے۔انھیں کسی جذبہ، خیال، احساس اور پرکیف فضا وسماں کی منظر کشی میں قدرت حاصل ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور خوبصورت تشبیہات واستعارات کے توسط سے جیتی جاگتی دنیا خلق کر دیتے ہیں۔ان کے یہاں انسان کی داخلی ونفسیاتی کیفیات، خوشی وغم، اداسی ومایوسی، کرب واضطراب، شادمانی ومسرت، حسین خواب وارمان وغیرہ کی صدہا تصویریں رقص کر رہی ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

افسانہ ''تشنگی کا سفر'' کا ہیرو اپنے دل کی کیفیت کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

> ''اس کے جسم کے لمس سے میرے انگ انگ میں گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے۔اس کی تیز تیز سانسوں کی حدّت سے میرا وجود پگھلنے لگا ہے۔میرے اندر شعلے سے لپکنے لگے ہیں اور رگ وپے میں چونٹیاں سی رینگنے لگی ہیں۔میری ہتھیلیاں اس کے دہکتے رخسار اور مرمریں گردن پر پھسل جاتی ہیں اور انگلیاں اس کے سیاہ ریشمیں بالوں کے آبشار میں نہانے لگتی ہیں۔''

(تشنگی کا سفر)

''پلکوں میں آنسو'' درد وغم اور کسک میں ڈوبا ہوا افسانہ ہے۔نسوانی کردار شہناز کی خوبصورتی اور دلکشی کو لفظوں کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھالا گیا ہے:

> ''شہناز ستاروں میں ماہتاب تھی! وہ قدرت کا حسین شاہکار تھی۔صبیح پیشانی پر مریم کا تقدس، شبنم میں دھلے ہوئے گلابی رخساروں پر نکھار، کیف میں ڈوبی ہوئی آنکھوں پر لانبی نوک دار پلکوں کی خوشنما جھالر، تراشیدہ یاقوتی ہونٹوں پر مونالیزا کا تبسم، متناسب جسم کے دلکش وجاذب نظر خطوط اور رفتار میں ایک شان تمکنت''

(پلکوں میں آنسو)

دلکش تشبیہات واستعارات اور خوبصورت امیجری نے اس اقتباس میں کس قدر شعریت پیدا کر دی ہے۔ یہ اقتباس قاری کے خوابیدہ احساسات وجذبات کو بیدار کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

''یادوں کے دریچے'' ان کا ایک اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ماضی کا ایک ایسا دریچہ ہے جس

سے زندگی کی رنگارنگی صاف نظر آتی ہے۔اس افسانے میں پرانی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ان یادوں میں خوشی اور شادمانی کے ترانے بھی بج رہے ہیں اور غم واداسی کا چراغ بھی روشن ہے۔در اصل یہ افسانہ حسین اور خوش نما یادوں کا ایک ایسا چمن زار ہے جہاں خوشی و غم ،تنہائی و مایوسی، نازک ولطیف جذبات واحساسات اور خوبصورت ارمان وآرزو کے ہزاروں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے ہوں۔اس افسانے کا ابتدائی اقتباس پیش خدمت ہے:

''آج ساری کائنات چاندنی میں نہا رہی ہے ... نہیں! بیوہ کی طرح سفید ساڑی میں ملبوس ہے۔دور آسمان پر چاند سسک رہا ہے، تارے سلگ رہے ہیں اور چاندنی دریچے سے میرے کمرے میں جھانک رہی ہے ... چاندنی... جس کے ہونٹوں پر بیکراں اداسی ہے، جس کی آنکھوں میں غم کے سایے لہرارہے ہیں۔''

(یادوں کے دریچے)

یادوں سے لپٹی ہوئی غم واداسی اور تنہائی ومحرومی کی کتنی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔ناز قادری کو فضا بندی پر غضب کی مہارت حاصل ہے۔وہ بے جان لفظوں کی مدد سے انسانی جذبے واحساس کی کتنی جاندار اور متحرک تصویر پیش کردیتے ہیں۔اس افسانے کا آخری اقتباس ملاحظہ ہوں:

''رات ڈھل چکی ہے۔سسکتا چاند غم سے نڈھال مغرب کی آغوش میں جھک گیا ہے، میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔میرے دل میں ٹوٹی ہوئی کرچیاں سی چبھ رہی ہیں اور میں غم واندوہ سے نڈھال اپنے پلنگ پر پڑے تکیہ کو سینے سے لگائے سسکیاں بھر بھر کر رو رہی ہوں، تڑپ رہی ہوں۔تکیہ آنسوؤں سے بھیگ رہا ہے اور میری سسکیاں خاموش فضا میں تحلیل ہو رہی ہیں۔''

(یادوں کے دریچے)

ناز قادری کی افسانوی کائنات حسن ودلکشی کے ہر ممکنہ اوصاف سے رچی بسی ہے۔انھوں نے روایتی فکر وموضوعات کو ایک اچھوتے انداز سے پیش کیا ہے۔دلکش بیانیہ اور منفرد اسلوب سے ان کے افسانوں میں جان سی پڑ گئی ہے۔ان کے یہاں یادوں کی کرنیں دل اور روح کو منور کرتی ہیں۔یادوں کی یہ کرنیں درد وکسک اور غم ومایوسی کے باوجود شادمانی اور مسرت کا انوکھا احساس دلاتی ہیں۔مختصر یہ کہ ناز قادری نے اردو افسانے کی راہ میں ایک ایسا دیا جلایا ہے جو قارئین کے دل کی کسک بھری یادوں کو تازہ دم رکھے گا۔

ظہیر انور کے سفرنامے

ظہیر انور ہم عصر اردو ڈرامہ اور تھیٹر کا ایک اہم نام ہے۔ پچھلی دو تین دہائی سے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے باعث انھوں نے ادبی منظرنامے پر اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔ وہ ڈراموں کے توسط سے انسانی زندگی کے رموز و نکات کو سمجھنے اور سمجھانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے کئی ڈرامے اہل ادب کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ وہ ڈرامے کی تنقید کی بھی اچھی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ڈرامے کی تنقید اور فن کے تعلق سے بھی ان کی دو کتابیں داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

ان کی ادبی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ وہ ایک اچھے سفرنامہ نگار اور مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے دو سفرنامے بھی تحریر کیے ہیں۔ پہلا سفرنامہ ''ایک عرض تمنا'' ۱۹۹۹ء میں اور دوسرا ''چراغ رہ گزر'' ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ پہلا سفرنامہ پاکستان کے سفر کی روداد ہے تو دوسرا لندن کی معاشرتی، تہذیبی، تاریخی، علمی اور ادبی رنگارنگی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دونوں ہی سفرنامے خوش اسلوبی سے ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں۔

''ایک عرض تمنا'' سیاسی نوعیت کا سفرنامہ ہے۔ دراصل تقسیم ہند کا حادثہ برصغیر کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں پیش آنے والی حیوانیت و درندگی انسانیت اور بھائی چارگی کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ تقسیم نے نہ صرف ملک کے دو ٹکڑے کیے بلکہ دلوں کو بانٹ دیا۔ صدیوں پرانی تہذیب ایک آن میں مٹ گئی۔ اہل وطن اپنی سرزمین و مٹی کو چھوڑ کر ایک اجنبی دیار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ تب سے لے کر آج تک دونوں ملکوں کا آپسی رشتہ کئی نازک مراحل سے گزرتا رہا ہے۔ ان تمام تر پیچیدگیوں اور سیاسی کشمکش کے پہلو بہ پہلو دونوں ملکوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کی دیوار کو گرانے کی بھی کوششیں جاری رہیں۔ پیش نظر سفرنامہ ایسی ہی کوشش کا خوشگوار نتیجہ ہے۔

۲۱ اور ۲۲ رنومبر کو پشاور میں ''انجمن برائے امن و جمہوریت'' کے زیر اہتمام ایک سیاسی جلسے کا انعقاد ہوا

۔اس جلسے میں شرکت کی غرض سے ظہیر انور ہندوستان کے وفد کے ہمراہ پاکستان پہنچے۔انھوں نے اس جلسے کی کاروائی کی تمام تر صورت حال کو اس سفرنامے کے روپ میں پیش کیا ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے پاکستان کے مختلف تاریخی شہروں مثلاً لاہور، سرگودھا، اسلام آباد اور پشاور وغیرہ کا دورہ بھی کیا۔اپنے سفر کے دوران انھوں نے پاکستان کے سماجی، معاشرتی، تہذیبی، تاریخی، سیاسی، علمی اورادبی حالات ومسائل کو اپنے مشاہدات اور تجربات کا حصہ بنایا۔ یہ سفرنامہ مصنف کے انھیں مشاہدات وتجربات کا خوبصورت عکس ہے۔ ہر چند کہ پاکستان کے ان حالات ومسائل کو وقتاً فوقتاً تخلیقی اور غیر تخلیقی سانچے میں پیش کیا جاتا رہا ہے لیکن زیرِ مطالعہ سفرنامہ مصنف کی گہری بصیرت اور فکر وآگہی کا آئینہ دار ہے۔ظہیر انور کے سفرنامے اپنے بعض فکری وفنی اوصاف کے سبب ہمیں متاثر کرتے ہیں۔

اوّل یہ کہ ان کے یہاں ایک خاص طرح کی کیفیت ملتی ہے۔مثلاً وہ جس معاشرے اور جس ماحول کی تصویر پیش کرتے ہیں،اس کی نہایت جاندار اور چلتی پھرتی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔دوسری اہم بات یہ کہ انھوں نے تقابل کا انداز بھی اختیار کیا ہے۔وہ کسی مرحلے سے سرسری طور پر نہیں گزرتے بلکہ اس کے جزئیات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ کسی چیز سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ ہر چیز کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ تجزیاتی طریقۂ کار کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔مصنف نے اپنے اسلوب اور زبان وبیان کی شگفتگی اور دلکشی سے سفرنامے میں تخلیقی حسن کا جادو جگایا ہے۔ان کے سادہ اور خوبصورت بیانیہ سے سفرنامے میں تخلیقی حسّیت کا گمان ہوتا ہے۔

سفرنامہ نگار نے پاکستان کی سرزمین اور وہاں کی تہذیب وتمدن سے اپنی جذباتی وابستگی کو نہایت والہانہ انداز میں پیش کیا ہے۔انھیں وہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے اور بات کرنے کی مزید خواہش ہوتی ہے۔ سینے میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔۱۷ر نومبر کو سفر کا آغاز ہوتا ہے۔سفر بذریعہ ٹرین طے ہوتا ہے۔سفرنامہ میں جگہ جگہ خوبصورت اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں۔سفرنامے کی ابتداء میں پیش کیا گیا یہ شعر موصوف کے جذبات واحساسات کی کتنی سچی عکاسی کرتا ہے۔

ابھی رشتوں کی دھوپ چھاؤں نہ دیکھ
ہم سفر دور کا سفر ہے یہ

یہ وفد پنجاب اور امرتسر سے ہوتے ہوئے پاکستان پہنچتا ہے۔لہٰذا سفرنامے کے آغاز میں امرتسر کا بھی ذکر ملتا ہے۔امرتسر میں انھیں اس خونی سانحہ کی یاد آتی ہے۔ یہ یاد انھیں صدمے اور غم سے دوچار کرتی ہے۔ انھوں نے جلیان والا باغ کے سانحے کو حساس طریقے سے بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں وہ کچھ اس طرح اپنے

جذبات واحساسات کو بیان کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''اچانک فضا میں جنرل ڈائر کی آواز ابھرتی ہے''فائر''اور آزادی کے پروانوں پر گولیوں کی بارش شروع ہوتی ہے۔لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگ رہے ہیں۔ان میں بیشتر لوگ جان بچانے کے لیے مشہور تاریخی کنوئیں میں چھلانگ لگا رہے ہیں ۔ہمارے چہروں پر درد اور کرب کی ایک تصویر جم کر رہ گئی۔''

(ایک عرض تمنا،ص:۱۷)

اس اقتباس سے مصنف کی دردمندی اوران کا داخلی کرب نمایاں ہے۔اس ذیل میں انھوں نے ۱۹۴۷ء کے آس پاس کا تاریخی زمانہ، جہدآزادی، محبان وطن کی عظیم قربانی وغیرہ کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔مصنف نے اس موقع پر ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ادھم سنگھ، محمد اسمٰعیل، گردیال سنگھ، دین تاثیر، کوٹامل اور بدرالاسلام جیسے محبان وطن اوران کی قربانیوں کو عقیدت کے ساتھ یاد کیا ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے انسانیت سوز مظالم کو نہایت غم وصدمے کے ساتھ پیش کیے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی وطن کے آس پاس کا عہد پوری شدت کے ساتھ سانس لے رہا ہے۔

دورۂ پاکستان کے دوران سرزمینِ پنجاب میں بھی ان کا قیام رہا۔انھوں نے امرتسر کے تاریخی شہر کو بھی آنکھوں سے لگایا۔وہاں کی تہذیب ومعاشرت کو اپنے مشاہدات کا حصہ بنایا۔موصوف نے تاریخی گولڈن ٹمپل کو نظرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔سفرنامے میں تفصیل سے اس کا ذکر ملتا ہے۔گولڈن ٹمپل کا نقشہ کھینچتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

''سورن مندر کی دومنزلہ عمارت اور جھیل کے درمیان سورن مندر سورج کی ڈوبتی ہوئی سرخ کرنوں میں بے مثال نظارہ ہے۔سنگ مرمر سے بنی یہ عمارت اپنے عالی شان محرابوں، میناروں، سنہرے گنبدوں، برجوں اور منقش دیواروں نیز کراں تاکراں آنکھوں میں سماجانے والی سفیدی کی بنا پر ذہن ودل میں عجب اضطراب پیدا کررہی ہے۔''

(ایضا،ص:۲۴)

سرزمین پاکستان میں قدم رکھتے ہی ان کا دل خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ انھیں وطنِ عزیز کے تقسیم ہونے کا شدید افسوس ہے۔سفرنامہ نگار کوان سیاسی رہنماؤں سے سخت نفرت ہے ،جنھوں نے اپنے مفاد کے لیے معصوم اور بے گناہ لوگوں کے جذبات سے کھیلا۔ظہیرانور کے الفاظ میں ''خدائے برتر! تیری زمین پر زمین کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے۔''انھوں نے اس جملے میں کتنی فکرانگیز بات

کہی ہے۔ یہ جملہ گہرے طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تقسیم کو غیر فطری عمل قرار دیتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے حیوان صفت سیاسی رہنماؤں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے ان پر لعنت بھیجی ہے۔ مصنف کے ایک ایک لفظ سے معصومیت اور خلوص کا احساس ہوتا ہے۔ انھیں اس فیصلے پر تعجب بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''میں دیکھ رہا ہوں کہ ہوا کے پاؤں میں زنجیر نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ آدمی کی طرح بے بس اور مجبور ہے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ پرندے بھی مکمل آزادی کے ساتھ یہاں وہاں آجا رہے ہیں۔ ہم تو انسان ہیں، بغیر کسی سرکاری پروانے کے کیسے سرحد کو پاٹ سکتے ہیں۔ ہم تحفظ کے نام پر ان کے دستخط کے محتاج ہیں۔''

(ایضا،ص:۳۴)

مندرجہ بالا عبارت سے اس بات کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ ظہیر انور اس صورت حال سے کس قدر نالاں ہیں۔ انھیں تو سرحد سے شدید کوفت ہے۔ وہ پوری انسانی برادری کو ایک چھت کے نیچے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں سب کا غم ایک جیسا ہے۔ سب کی خوشیاں ایک سی ہیں۔

پھولوں کے شہر پشاور میں انھیں قیام کرنا ہے۔ وہاں کے مشہور ہوٹل گرانڈ میں انھیں ٹھہرنا ہے۔ وہاں پہنچ کر انھیں سب کچھ ہندوستان جیسا لگتا ہے۔ ''مملکتِ خداداد'' کی سرزمین پر پہنچتے ہی انھیں پاکستانی ادباء وشعراء کی یاد ستانے لگتی ہے۔ وہ احمد فراز، وزیر آغا، انتظار حسین، عبداللہ حسین، حبیب جالب، شہزاد منظر، ممتاز مفتی، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی وغیرہ کو عقیدت سے یاد کرتے ہیں۔ وہاں کے تاریخی وسیاسی نشیب وفراز بھی سفر نامے کے صفحات پر آویزاں ہیں۔ انھوں نے پشاور کی مشہور تاریخی عمارات کا ذکر بھی خصوصی طور پر کیا ہے۔

۲۱ر نومبر کو ہونے والی کانفرنس کے تعلق سے مصنف کے دل میں عجب سی سرخوشی ہے، امنگیں ہیں اور حسین خواب ہیں۔ انھوں نے وہاں کی غربت و مفلسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہاں کے سماجی وسیاسی حالات وکوائف سے واقفیت کے لیے لوگوں سے بات چیت بھی کرتے ہیں۔ اس سفر نامے میں وہاں کی سماجی و سیاسی ناہمواریوں پر گہرا طنز بھی ملتا ہے۔ پاکستان کی عدلیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے ''کیا یہاں بھی لوگ سیاہ بال کے ساتھ جاتے ہیں اور فیصلہ کے بغیر یا غلط فیصلے کے ساتھ سفید بال لیے لوٹتے ہیں۔'' اس طنز آمیز جملے میں انھوں نے ہندوستانی عدلیہ کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ پشاور میں ہونے والی کانفرنس میں نیوکلیئر ہتھیار، مسئلہ کشمیر، بم دھماکہ، فرقہ وارانہ تشدد، سیاچین، ویزا، غربت و مفلسی، دوقومی نظریہ، ہجرت اور دوسرے عصری مسائل پر بات چیت ہوتی ہے۔ زیر مطالعہ سفر نامے میں ان سب کا ذکر موجود ہے۔

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

قیام پاکستان کے دوران سفرنامہ نگار نے وہاں کے مشہور و معروف مقامات اور بازاروں کی بھی سیر کی۔ پاکستان کے احباب سے ملاقاتیں بھی کیں۔مشہور و تاریخی شہر لاہور بھی محل نظر رہا۔سفرنامے میں وہاں کی تہذیبی روایات، تاریخی حقائق، علمی وادبی ماحول اورعصری مسائل کو قدرے تفصیل سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ سفرنامے میں لاہور شہر چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔اقتباس پیش خدمت ہے:

''لاہور کی یاد سے اندر ہی اندر ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ لاہور کو فیضؔ نے روشنیوں کا شہر کہا ہے۔اس کی قدامت مسلم ہے کہ یہاں اکبر نے حکومت کی اور مغلوں کا سنہرا دور اسی دھرتی پر نکھرا کہ اسی لاہور میں بادشاہی مسجد ہے، شالیمار باغ ہے، لاہوری گیٹ ہے، مسلم مسجد ہے، انارکلی ہے، مشہور ٹی ہاؤس ہے، اس شہر کے دلسوز واقعات نے منٹو اور کرشن چندر سے کیسی کیسی کہانیاں لکھوائیں۔کیسی کیسی غم میں ڈوبی ہوئی تخلیقات سامنے آئیں۔''

(ایضا،ص:۸۷)

ایک دوسرا اقتباس دیکھیے:

''لاہور بٹوارے کے لمحوں میں سسکتا بلکتا بھی نظر آتا ہے۔اس کے سینے میں نہ جانے کتنے راز دفن ہیں۔بالکل ایسے ہی جیسے امرتسر کے سینے میں کتنی سسکیاں دفن ہیں۔''

(ایضا،ص:۸۷)

علی سردار جعفری کے مندرجہ ذیل اشعار کے ساتھ ہی سفرنامہ اختتام پذیر ہوتا ہے ؎

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر

واضح رہے کہ سفرنامے کی مجموعی فضا ہمیں ماضی کی حسرت ناک یادوں سے جوڑتی ہے۔ہمارے دلوں میں ایک گہرا نقش قائم کرتی ہے۔ایک ایسا نقش جس میں خوشی اور غم کا عکس بھی ہو اور اپنی تہذیبی روایات سے وابستگی کا حسین خواب بھی۔مختصر یہ کہ ظہیر انور کا یہ سفرنامہ قارئین کو غم واداسی اور یاس ومحرومی سے نکال کر زندگی کی صحت مند قدروں سے ہم کنار کرتا ہے۔دراصل یہ سفرنامہ ایک ایسا دریچہ ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے کی روشنی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

کسی بھی فن پارے یا تخلیق کی کامیابی کا راز بہت حد تک اس کے دلکش اسلوب اور تخلیقی زبان وبیان

میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ظہیرانور ایک تخلیق کار ہیں۔ان کا تخلیقی حسن ان کے تعمیری فکر وآ گہی میں نمو پاتا ہے۔وہ اپنی بات بڑے سلیقے سے کہنے کا فن جانتے ہیں۔وہ زبان و بیان کی پیچیدگی اور مشکل پسندی سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی یہ خوبی ونشان کچھ تو ان کے تعمیری ذہن کی عطا کردہ ہے اور کچھ ادبی ذوق کا نتیجہ۔اپنے طرز اسلوب کے اسی امتیازی وصف کے باعث وہ ترسیل کے مسئلے سے آزاد ہیں۔ وہ ایک اچھے ڈرامہ نگار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ڈرامے کی زبان و بیان اور طرز نگارش کے اپنے تکنیکی تقاضے ہوتے ہیں۔وہاں ایک مخصوص طرح کی نثر استعمال ہوتی ہے۔مکالماتی انداز کا پایا جانا شرط ہے۔ یہاں مشکل پسندی کا گزر نہیں۔لہٰذا یہ تمام تر اوصاف ظہیرانور کی نثر میں رچے بسے ہیں۔ایک سفرنامہ نگار کی حیثیت سے بھی انھوں نے اپنے اسی عام فہم اور دلکش طرز بیان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر استعمال کیا ہے۔

ان کا یہ سفرنامہ زبان و بیان اور طرز ادا کی خوبیوں سے آراستہ ہے۔الفاظ کے برمحل استعمال، جملے کی سادگی و اختصار، بیان کی صفائی و روانی اور خوبصورت تشبیہات و استعارات کی شمولیت سے ان کی تخلیقی نثر میں جان سی پڑ گئی ہے۔ان کے یہاں کسی قسم کی جھنجھلاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔انھوں نے بعض اوقات طنز و مزاح اور شوخی سے بھی کام لیا ہے۔ زیر مطالعہ سفرنامہ میں کہیں کہیں رپورتاژ کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ان کے اسلوب و نثر کے یہی اوصاف انھیں ایک منفرد و ممتاز سفرنامہ نگار بناتے ہیں۔

خوبیوں کے علاوہ زبان و بیان کی سطح پر چند خامیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔کہیں کہیں علاقائیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔تذکیر و تانیث کے حوالے سے بھی کچھ غلطیاں ملتی ہیں۔منظر نگاری، جزئیات نگاری، زبان و بیان اور طرز اسلوب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- ''شاہراہوں پر گہری خاموشی میں ڈوبی رات، آسمان پر کھلا چاند ستاروں سے ہم کلام ہے۔''
- ''برسوں بعد آج ایسا ہی ایک لمحہ ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔''
- ''سرد موسم میں دھوپ کی تمازت بھلی لگ رہی ہے۔''
- ''لاہور شہر کے تصور نے خون میں روانی تیز کر دی۔''
- ''بستر پر دراز ہوتے ہی نیند کی دیوی تھپکیاں دے کر سلانا چاہ رہی ہے۔''
- ''میری آنکھوں میں اچانک ایک تصویر بنتی چلی جاتی ہے۔''

پیش کی گئیں یہ مثالیں ظہیرانور کی زبان و بیان اور طرز نگارش کے اوصاف کو نمایاں کرتی ہیں۔ ظہیرانور ایک منجھے ہوئے نثر نگار ہیں۔ وہ موضوع و مواد کے پیش نظر لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں۔ان کی نثر میں قاری کو اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ان کے دوسرے سفرنامے میں بھی لب ولہجہ کی یہی خوبی ملتی ہے۔

ان کا دوسرا سفرنامہ ''چراغ رہ گزر'' بھی اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ سفرنامہ ''ایک عرض تمنا'' سے چار سال قبل شائع ہوا تھا۔ موضوع اور فکر کی مناسبت سے یہ سفرنامہ ''ایک عرض تمنا'' سے ذرا مختلف ہے۔ سفر کے اغراض ومقاصد کے پیش نظر اسے علمی وادبی سفرنامے کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ''اردو ٹرسٹ'' کے زیر اہتمام لندن میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس اس سفر کا سبب ہے۔ اس سے قبل بھی موصوف کسی سیمینار میں شرکت کی غرض سے لندن کا سفر کر چکے تھے۔ انھوں نے اس بات کا ذکر سفرنامے کے آغاز میں کیا ہے۔

اس تصنیف کی ابتداء میں ایک فہرست کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس فہرست میں مختلف عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ان عنوانات کے تحت ہی لندن کے سفری حالات وکوائف اور تجربات ومشاہدات کو حقیقت پسندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ظہیر انور سفر کو زندگی کی علامت تصور کرتے ہیں۔ عنوان ''سفر ہے شرط'' کے تحت انھوں نے کتنی فکر انگیز بات کہی ہے کہ ''سفر زندگی ہے، نغمگی ہے اور روشنی ہے۔ ابتداء سے ہی مسافروں کے لیے بلکہ سفر مسلسل بصیرت اور بصارت کا استعارہ ہے۔''

سفرنامہ ''چراغ رہ گزر'' ایک ایسے نگارخانہ کی مانند ہے جس میں لندن کی سماجی، تہذیبی، معاشرتی، تاریخی اور سیاسی زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ اس میں لندن کی علمی وادبی عظمت وافادیت بھی جلوہ گر ہے۔ سحر انگیز فضا سے معمور یہ سفرنامہ ایک ایسا دریچہ ہے جس سے لندن کی چلتی پھرتی زندگی کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ لندن کی تہذیبی ومعاشرتی رنگارنگی اور بوقلمونی کا بیان قاری کو ذہنی طور پر کچھ اس طرح مبہوت کرتا ہے کہ اسے لندن کی فضاؤں میں سانس لینے کا بھرم پیدا ہوجاتا ہے۔ معروف فکشن نگار جوگیندر پال نے بھی سفرنامے کے اس وصف کا اعتراف کرتے ہوئے فلیپ میں لکھا ہے کہ ''لندن میرا دیکھا ہوا ہے تاہم ظہیر انور کی ذات میں میں گھلے ملے اس لندن میں چل پھر کر مجھے یہ اجنبی شہر اپنا کوئی شناسا معلوم ہونے لگا ہے یقین نہ آئے تو آپ بھی پڑھ کر دیکھ لیجیے۔''

سفرنامہ ''ایک عرض تمنا'' کی طرح یہاں بھی ان کے گہرے مشاہدے وتجزیے کا احساس ہوتا ہے۔ صرف کیمرے کی نظر سے کسی چیز کی تصویر پیش کر دینا کمال نہیں ہے بلکہ اپنے مشاہدات اور فکر وآگہی کی روشنی میں کسی بات کو کہنا یا کسی تصویر کو پیش کرنا تخلیقی قوت کی دلیل ہے۔ یہی خوبی کسی سفرنامے کو اعتبار کا درجہ عطا کرتی ہے۔ اگر سفرنامے میں یہ فنی بصیرت بروئے کار نہ لائی گئی تو وہ اخباری رپورٹ یا اخباری فیچر ہوکر رہ جائے گا۔ فن کی اس کسوٹی پر ظہیر انور کے سفرنامے کھرے اترتے ہیں۔

لندن کے سفر کے دوران موصوف وہاں کی چمک دمک اور وہاں کی رعنائی وحسن سے مرعوب نہیں ہوتے

بلکہ ایک سیاح کی حیثیت سے ان چیزوں پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالتے ہیں۔ مشاہدے کی گہرائی، تجربے کی وسعت اور تخیل کی رنگ آمیزی ان کی تخلیقی کائنات کو امتیازی جہتوں سے ہم کنار کرتی ہے۔ وہ کسی بھی چیز پر محض ایک سرسری نظر نہیں ڈالتے بلکہ گہرائی میں ڈوب کر موتی چن لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس سفرنامے میں لندن کے بعض تاریخی حقائق اور وہاں کی عصری زندگی کے نشیب وفراز وغیرہ کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ ظہیر انور کلکتہ کی تہذیبی زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس سفرنامہ میں انھوں نے لندن اور کلکتہ کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے مابین تقابل کے چند پہلو بھی نکالے ہیں۔

سفر کے آغاز میں وہ کئی طرح کے احساسات سے دوچار ہیں۔ دل میں غضب کی حسرتیں اور امنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ظہیر انور اپنی داخلی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''میں بھی سوچتا ہوں کہ یادوں کا سلسلہ دراز ہوگا۔ منظر آنکھوں میں تادیر جھلملائیں گے۔ کیسے کیسے لوگوں کی ملاقات کی روداد اور رفاقت سے ذہن ہم کنار رہے گا۔ کچھ حسین وادیاں، کئی سنسان راستے، کچھ بے پناہ سپر بازار، چند ایک خوبصورت پہاڑ اور سبزہ زار اور زندگی کی دھوپ چھاؤں کے علاوہ سفر کی گرد میں لپٹی تاریخ کی کچھ مبہم تصاویر۔ امیدوں کا ایک طویل سلسلہ اور شب وروز کی روداد کسی لائٹ ہاؤس کی روشنی سے کم نہیں۔''

(چراغ رہ گزر، ص:۱۲-۱۱)

۱۶/اگست ۲۰۰۱ء کو وہ لندن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں۔ سفر کے دوران درپیش مسائل کو بھی سفرنامے میں بیان کیا گیا ہے۔ انھیں وہاں کا انتظامیہ بے حد پسند آیا۔ سیکیورٹی سے وابستہ افسران کی خوش اخلاقی قابل ذکر لگی۔ ایرپورٹ پر پیش آئے واقعے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ایئرپورٹ پر ایک افسر نے نہایت سلیقے سے میرے سامان کا معائنہ کیا اور خود ہی نہایت سلیقے اور قرینے سے ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ پر رکھ کر جانے کی اجازت دی۔ ہمارے کلکتہ میں کسٹم افسران سامان کا معائنہ کے لیے سامانِ سفر کو خطرناک حد تک بے ترتیب کر دیتے ہیں۔ اور دوبارہ قرینے سے سجانے کی ذمہ داری آپ ہی کی ہوتی ہے۔''

(ایضاً ص:۲۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہندوستانی انتظامیہ پر مزاح کی چادر میں لپٹا ہوا شدید طنز ہے۔ سفرنامے میں لندن اور دوسرے معروف شہروں کی سماجی اور معاشرتی زندگی مثلاً وہاں کا آداب گفتگو، بود وباش، خورد ونوش، آمد ورفت کے ذرائع، علمی اور ادبی ادارے وغیرہ کی دلکش ودلچسپ تصویرکشی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ سفرنامے

میں لندن کے لوگوں کے افکار وخیالات، جذبات واحساسات، زندگی کے تئیں ان کا رویہ، روشن اور تابناک مستقبل کا خواب اور آزادی رائے وغیرہ کی دلچسپ اور واضح عکاسی کی گئی ہے۔ سفرنامے میں لندن کے میخانے اور پب بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے وہاں کے ہوش ربا مناظر بھی دیکھے۔ ان سب کا ذکر باریک بینی اور حقیقت پسندانہ انداز میں کیا گیا ہے لیکن ہر جگہ اعتدال اور توازن برقرار ہے۔ شراب نوشی اور مے خانے کو لندن کی تہذیبی زندگی کا حصہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''یہاں ہر علاقے میں چھوٹا سا پب یا میخانہ ہونا ضروری ہے اور شاید سماجی زندگی میں یہ میخانے بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ میخانے کی خوبصورت فضا میں پہلے ہی کچھ لوگ بیئر اور وہسکی کی چسکیاں لے رہے تھے اور کچھ نیم برہنہ عورتیں بھی جمع تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں شراب کے پیالے اور جام چھلک رہے تھے۔ آنکھوں میں غضب کا نشہ تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نظر ادھر کو چلی جاتی۔''

(ایضاً،ص:۳۱)

انھوں نے وہاں کی جنسی بے راہ روی اور بے روح مادہ پرستی کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ سفرنامہ نگار نے وہاں کی بے حیائی اور عریانیت پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے یہ سوال قائم کیا ہے کہ بے حیائی اور بے شرمی کسی مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کی تہذیب کا حصہ کیسے ہوسکتی ہے؟ ''عجائبات فرنگ'' اردو کا پہلا سفرنامہ ہے۔ کمبل پوش نے اپنے اس سفرنامے میں لندن کی معاشرتی، تہذیبی اور سماجی صورت حال بالخصوص شراب نوشی، عریانیت، جنسی بے راہ روی، حسن وخوبصورتی، عیش وعشرت وغیرہ کی کیسی کیسی تصویریں پیش کی ہیں۔ انگلستان کی تہذیب سے اس قدر مرعوبیت احساس کمتری کی دلیل ہے۔ وہ حسین عورتوں کو دیکھتے ہی فریفتہ ہوجاتا ہے اور بدصورت عورتوں سے دور بھاگتا ہے۔ کمبل پوش کے الفاظ میں:

> ''ایک بارگی ایک رنڈی پری زاد نکلی۔ اس کے دیکھنے سے میری آنکھوں میں ٹھنڈک آئی۔ عجب صورت رکھتی تھی کہ چاند کو شرماتی۔ اس کی آواز سننے کے لیے سارا بدن کان ہوا اور صورت دیکھنے کے لیے ہر عضو آنکھ بنا۔''

(عجائبات فرنگ،ص:۱۰۸)

ظہیر انور ایسے مناظر کے بیان میں محتاط رویّے سے کام لیتے ہیں۔ ان کے یہاں شائستگی اور سنجیدگی ملتی ہے۔ وہاں کی عریانیت اور جنسی آزادی ظہیر انور کو اپنے وطن کی تہذیبی واخلاقی قدروں کی یاد دلاتی ہے۔ طلسماتی شہر لندن کو انھوں نے اپنے احساس اور اپنی فکر کا حصہ بنالیا ہے۔ موصوف نے وہاں کی

آزادروی اور مادہ پرستی کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔ ایک ایسے ہی منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شہر کے احاطے میں دو سفید فام جوڑے ایک جسم اور ایک جان بنے، ایک دوسرے میں باہم گھتے ہوئے بوس و کنار میں مبتلا ہیں۔ ہر لمحے خوبصورت دھوپ بھرے دن میں جوان عورتیں نیم برہنہ لباس میں گزرتی جارہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں لندن میں صرف حوریں ہی اتاری گئی ہیں۔ ہمارے چچا غالب گوروں کی ان بستیوں سے گزرتے تو انھیں لاکھوں برس کی حوروں کا دکھ نہ ہوتا۔''

(چراغ رہ گزر، ص:۱۲۶)

سفرنامہ نگار نے اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام لندن یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی کانفرنس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ کانفرنس کے دن صبح کا حسین موسم ہے۔ آسمان میں بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہوتی ہے۔ ایسے میں انھیں اپنے بچپن کا زمانہ یاد آتا ہے۔ بھولی بسری یادیں ذہن میں چھا جاتی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں گنگناتے ہیں:

Rain Rain Go Away

Come Again Another Day

اس کانفرنس میں اردو زبان وادب کے روشن مستقبل کے امکانات پر کارآمد گفتگو ہوئی۔ اردو زبان کی موجودہ صورت حال کے موضوع پر مقالے پڑھے گئے۔ انگلستان بالخصوص لندن سے شائع ہونے والے اردو اخبارات ورسائل کا جائزہ پیش کیا گیا۔ کانفرنس میں دیگر ممالک سے آئے ہوئے مہمانان نے اردو کی ترقی وفروغ اور اس کے لائحہ عمل پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ کانفرنس میں اپنی تقریر کے دوران ایک صاحب نے کہا ''وقت بغدادی قاعدے سے آگے نکل چکا ہے۔ اب ہماری ذمہ داری اپنی آنے والی نسل کے لیے مزید دشوار گزار رہے۔'' ظہیر انور نے کانفرنس کے تمام تر لوازمات کو اپنے مشاہدات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

انھوں نے لندن کی عدلیہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ سفرنامہ نگار نے وہاں کے ایک مجسٹریٹ کورٹ کا دورہ بھی کیا۔ انھیں وہاں کا عدلیہ نظام پسند آیا۔ اس سلسلے میں موصوف نے اپنے ملک کی عدلیہ میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں پر اظہار افسوس بھی کیا ہے۔ لندن میں وکالت کے پیشے سے منسلک خواتین کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ ظہیر انور وہاں کے عدل وانصاف کے طریقۂ کار سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہاں کی عدلیہ کو عوام کی حمایت حاصل ہے۔ وہاں ہندوستان کی طرح تاریخ پر تاریخ نہیں پڑتی بلکہ فیصلے جلد ہوتے

ہیں۔سفر نامہ نگار کے لفظوں میں:

''ہماری عدالت میں بھیڑ بھی ہوتی ہے اور ماحول بھی پراگندہ ہوا کرتا ہے۔عدالت کی ایک ایک سیڑھی آپ کی جیبیں کترتی ہے۔ یہاں ہر شئے بکاؤ ہونے کے ساتھ حیرت انگیز افراتفری نظر آتی ہے۔ وہاں ججوں کی ایمانداری کے پہلو بہ پہلو وکیلوں کی ایمانداری پر بھی لوگوں کا اعتماد بحال ہے۔''

(ایضاً،ص:۴۸)

ظہیرانور انگریزی زبان وادب سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں۔اس بات کا جواز سفرنامے سے فراہم ہوتا ہے۔انھوں نے سفرنامے میں انگریزی کے مشہور ومعروف ادباء وشعراء کا ذکر بھی کیا ہے۔جگہ جگہ ان ادباء وشعراء کے فکروفن پر گفتگو کی گئی ہے۔ انگلستان کے قیام کے دوران ظہیرانور کو ان عظیم ہستیوں کی بے طرح یاد آتی ہے۔انھوں نے شیکسپیئر،ملٹن، ولیم ورڈس ورستھ، الیٹ، کولرج، جان رسکن، ہارڈی، آرنلڈ وغیرہ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔انھوں نے بعض ادیبوں کے آبائی وطن بھی دیکھے۔ان فضاؤں میں سانس بھی لی۔اس کے علاوہ سفرنامہ نگار نے لندن کے جغرافیائی اور وہاں کے قدرتی مناظر بھی دیکھے۔خوبصورت جھیل، دریا،اونچے پہاڑ، دلکش باغات اور جھاڑیاں، حسین فضا، بھیگے موسم وغیرہ سب کچھ سفرنامے میں اپنا جلوہ بکھیر رہے ہیں۔

شہرلندن اپنی علمی وادبی فضا کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں ادب، آرٹ اور فنون لطیفہ کے نت نئے تجربے ہوتے رہے ہیں۔شیکسپیئر نے تھیٹر کی دنیا کو اپنے ڈراموں کے ذریعہ رونق بخشی تو ملٹن، الیٹ اور ولیم ورڈس ورستھ نے اپنی شاعری کے ذریعہ جادو جگایا۔لندن نے سنگ تراشی اور پینٹنگ کے فن میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ یہاں کے فن کاروں نے بڑے بڑے شاہکار پیش کیے۔ یہاں کے عجائب گھر اور آرٹ گیلری پوری دنیا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ظہیرانور کی اس کتاب میں لندن کے عجائب گھر اور آرٹ گیلری کا ذکر بھی موجود ہے۔ وہ یہاں کے آرٹ گیلری کو فن اور آرٹ کا خوبصورت معجزہ قرار دیتے ہیں۔موصوف نے گلوب تھیٹر کی بھی زیارت کی۔اس تھیٹر کو دیکھتے ہی انھیں عظیم ترین ڈرامہ نگار شیکسپیئر کا زمانہ یاد آ گیا۔انھوں نے اس تھیٹر کی تاریخی اہمیت اور اس کی بناوٹ ورکھ رکھاؤ پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔گلوب تھیٹر کی عمارت پرانے طرز تعمیر کی حسین یادگار ہے۔مصنف کے الفاظ میں تھیٹر کا نقشہ ملاحظہ ہو:

''پہلی نظر میں ہی کھپریل کی وہ چھت نظر آتی ہے جس سے شیکسپیئر کا زمانہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔سفید رنگوں میں گلوب تھیٹر ایک نئے طرز کا احساس پیدا کر رہا تھا۔ابھی

ابھی میں نے جدید زندگی کے نظاروں اوراس کی وسعتوں سے ذہن ودل کے گوشوں کو منورکیا تھا اوراب جدید زمانے میں تقریباً ساڑھے چارسوسال کی تاریخ میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ روزتو روزِعید سے کم نہیں۔''

(ایضا،ص:۱۵۳)

یہ اقتباس سفرنامہ نگار کے گہرے احساسات اوران کی ذہنی آسودگی کی خوبصورت ترجمانی کرتا ہے۔ تھیٹر میں انھوں نے شیکسپیئر کے المیہ ''کنگ لیئر'' پرمبنی ڈرامہ بھی دیکھا۔انھوں نے ڈرامے کی پیش کش کے طریقہ کار کی بعض خوبیوں اورخامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان دونوں سفرناموں میں تخیل کی آمیزش کم ہے۔ حقیقت پسندانہ طرزفکر پرزیادہ توجہ دی گئی ہے۔ زبان وبیان اوراسلوب کے نقطۂ نظر سے بھی دونوں سفرنامے دلچسپ اوراہم ہیں۔ ان سفرناموں میں قاری کوگرفت میں لینے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ظہیرانور کے یہاں جہاں ماضی کی حسرت ناک یادیں ہیں وہیں تابناک اورروشن مستقبل کا حسین خواب بھی موجود ہے۔انھوں نے عصری مسائل کوبھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔ دونوں سفرنامے متعلقہ عہد کی معاشرتی،تہذیبی، سیاسی،تاریخی،علمی اورادبی صورت حال کی حقیقی تصویریں پیش کرتے ہیں۔مختصر یہ کہ اردو کے ہم عصر سفرناموں میں زیرمطالعہ دونوں سفرنامے فکروفن کے اعتبار سے منفرد اوراہم مقام رکھتے ہیں۔

ہندوستان پاکستانی کی نظر سے

(چند جھلکیاں)

سفر نامہ ایک اہم اور کارآمد ادبی صنف ہے۔اس کے مطالعے سے قاری کو کسی اجنبی ملک اور سرزمین کے تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، تاریخی وسیاسی حالات وکوائف سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ نیز وہاں کے جغرافیہ، حیوانات، نباتات وغیرہ کی مسحورکن جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔کم وبیش دنیا کی ہر زبان میں اس کی روایت ملتی ہے۔

ملک ہندوستان اپنی قدیم ثقافتی اور جغرافیائی رنگارنگی کے باعث دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔قدیم زمانے سے سیاح یہاں آتے رہے اور یہاں کی تہذیبی و ثقافتی، تاریخی و جغرافیائی نقوش کو اپنے سفرناموں میں رقم کرتے رہے ہیں۔ان سیاحوں کے لکھے گئے بعض سفرنامے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔قدیم زمانے میں ہندوستان آنے والے سیاحوں میں میگاستھنیز، ابن بطوطہ، البیرونی وغیرہ کے نام بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ہندوستان ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے غلامانہ تسلط سے آزاد ہوتے ہی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔اس طرح نیا ملک پاکستان وجود میں آیا۔ملک کی ایک بہت بڑی آبادی پاکستان ہجرت کرگئی۔ان ہجرت کرنے والوں میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے اس نئے ملک اور اس نئی سرزمین کا خیر مقدم کیا۔تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے مسائل اور زندگی کے رویے یکساں تھے۔دونوں طرف سے ہجرت کرنے والوں نے اپنے آبائی وطن کوالوداع کہا تھا۔یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنے آبائی وطن اور وہاں کی سرزمین پر گزارے شب وروز سے تاعمر ذہنی اور نفسیاتی وابستگی رکھتا ہے۔وہاں گزارے ہوئے خوش گوار لمحات اور وہاں کی حسرت ناک یادیں اسے ذہنی طور پر ہمیشہ اپنے ہمراہ لیے رہتی ہیں۔اپنے آبائی وطن جاکر انسان روحانی اور قلبی سکون حاصل

کرتا ہے۔سید علی اکبر ایک پاکستانی شہری ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں نقل مکانی کرکے پاکستان جابسے۔ یہ نقل مکانی اختیاری تھی۔سید علی اکبر رضوی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہم نے پاکستانی شہریت اختیاری طور پر حاصل کی تھی،کسی جبر وقہر یا مجبوری کے تحت نہیں۔I am a Pakistani by option not by compulsion ہندوستان جہاں ہم پیدا ہوئے ۔ پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی اب ہمارے لیے غیر ملک ہے اور اب ہم وہاں اجنبی اور غیر ملکی کی حیثیت سے جاتے ہیں۔ہم نے از خود نقل مکانی کی تھی۔نقل مکانی اور ہے اور ہجرت بالکل جدا شے ہے۔فرق بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔''

(بھارت میں چار ہفتے،سید علی اکبر رضوی،ص:۵۹)

''بھارت میں چار ہفتے'' سید علی اکبر رضوی کا دلچسپ اور معلومات افزا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔سفر نامہ نگار ۷ار فروری ۱۹۹۹ء سے ۷ار مارچ ۱۹۹۹ء تک ہندوستان میں بحیثیت سیاح قیام پذیر رہے۔دوران سفر انھوں نے ملک کے مختلف شہروں اور تاریخی مقامات مثلاً بنارس،لکھنؤ،علی گڑھ،کلکتہ،دہلی اور اعظم گڑھ وغیرہ کا دورہ کیا۔انھوں نے ان تاریخی وتہذیبی شہروں کی ادبی،علمی،ثقافتی،جغرافیائی اور تاریخی صورتحال کا بغور مشاہدہ کیا۔پیش نظر سفر نامہ اسی مشاہدے اور سیاحت کا خوشگوار نتیجہ ہے۔

سفر نامے کے ابتدائی حصے میں مختلف مقامات پر کھینچوائی گئی تصویریں بھی شامل ہیں۔دوران سفر پیش آنے والے حالات ومسائل کو انھوں نے بے حد خوبصورت ومنظّم طریقے سے پیش کیا ہے۔سفر نامے میں اردو، فارسی کے اشعار ومقولے بھی موقع ومحل کے اعتبار سے شامل کیے گئے ہیں۔اس کتاب سے سید علی اکبر رضوی کی اس سرزمین سے گہری عقیدت اور ان کی ذہنی وجذباتی وابستگی جھلکتی ہے۔ایک پاکستانی کی حیثیت سے انھوں نے اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور یہاں کے رنگا رنگ کلچر کو پیش کیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک لمبی مدت بعد بھی ان کے سینے میں ایک ہندستانی کا دل دھڑک رہا ہے۔کتاب کا ایک ایک لفظ اس کی شہادت فراہم کرتا ہے۔

زیر مطالعہ سفر نامے کے آغاز میں سفر کے مختلف مراحل کو ایک فہرست کی شکل دی گئی ہے۔مثلاً دعوت سفر، بھارت روانگی،لکھنؤ آمد،لکھنؤ دستر خوان،قیام بنارس وغیرہ وغیرہ۔اس سے ہندوستانی تہذیب وثقافت اور یہاں کی تاریخی،علمی اور ادبی روایات پر روشنی پڑتی ہے۔سید علی اکبر رضوی ۷ار فروری کو بذریعہ ہوائی جہاز سرزمین ہند (دہلی) پر قدم رکھتے ہیں۔دہلی سے پھر انھیں بذریعہ جہاز لکھنؤ جانا تھا۔لیکن لکھنؤ کی فلائٹ چھوٹ جانے کے سبب انھیں اس شب دہلی میں ہی قیام کرنا پڑا۔وہ اپنے اس تجربے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم سب تیزی سے نیشنل ایئر پورٹ پہنچے لیکن ہماری تیز رفتاری کچھ کام نہ آئی لکھنؤ کی فلائٹ

روانہ ہو چکی تھی۔ چار و نا چار ایک شب دہلی میں قیام کرنا پڑا۔ گویا وہاں کے دانوں پر ہمارے نام کی مہر لگی تھی۔''

(ایضاً،ص:۶۱)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''دہلی بھارت کا دارالخلافہ اور عظیم شہر ہے۔ بے شمار چھوٹے بڑے ہوٹل ہیں پھر بھی بغیر پیشگی ریزرویشن ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ٹیلی فون کھڑکائے گئے۔ بعد از دشواری بسیار، ایئرپورٹ کے قریب ہی ایک ہوٹل میں ہم سب کو سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ ہم نے خدائے قدوس کا شکر ادا کیا۔ ہمیں تو صرف رات بسر کرنی تھی۔ اس سے کیا بحث کہ ہوٹل فور اسٹار ہے یا فائیو اسٹار۔''

(ایضاً،ص:۶۲)

دوسرے دن وہ لکھنؤ روانہ ہوئے۔ وہاں انھیں کسی علمی ادارے کی تقریب میں شامل ہونا تھا۔ لکھنؤ کے دوران قیام انھوں نے وہاں کے علمی اور ادبی اداروں کی زیارت بھی کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے لکھنؤ کی اہم تاریخی عمارات مثلاً امام باڑہ، بھول بھلیاں، رومی دروازہ، کلاک ٹاور، حسین آباد پارک وغیرہ کی سیر کی۔ ان سب کا ذکر سفرنامے میں نہایت دل کش انداز میں ملتا ہے۔ سفرنامے میں مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کے مزار کا ذکر بھی موجود ہے۔ سفرنامہ نگار نے ان کی مزار پر گلہائے عقیدت بھی پیش کیے۔ سب سے خاص بات تو یہ ہے کہ سید علی اکبر رضوی کو لکھنؤ کی شاہانہ طرز زندگی، وہاں کی بیش بہا تہذیب و ثقافت، خورد و نوش اور بود و باش وغیرہ بے حد پسند آئے۔ انھوں نے لکھنؤ کی مہمان نوازی کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے۔

''لکھنوی دسترخوان'' کے عنوان کے تحت سفرنامہ نگار نے یہاں کے مختلف قسم کے لذیذ اور مرغن غذاؤں اور یہاں کی نفاست پسندی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھنؤ کھانے میں پرت دار پراٹھا (چودہ پرت) رومالی چپاتیاں، سیخ کباب، چکن تکہ بہ رنگ زعفران، یخنی پلاؤ اور ٹنڈے کباب وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ٹنڈے کباب کے ذکر کے بغیر لکھنؤ کی ثقافت ادھوری ہے۔ موصوف نے فوٹ نوٹ میں ٹنڈے کباب کی تاریخی روایت کو بھی دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے۔ سید علی اکبر رضوی اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''ٹنڈے کباب کی پلیٹ کی طرف خود بخود ہاتھ بڑھ گیا اور ایک کباب لے لیا۔ کھایا تو بے حد مزہ آیا، نہایت لطیف، لذیذ اور نازک ٹنڈے کا کباب۔ یقیناً ایسا لذیذ کباب نہ پہلے کھایا تھا اور نہ میں نے ٹنڈے کباب کے بارے میں سنا تھا۔''

(ایضاً،ص:۸۱)

سفر نامہ نگار کولکھنؤ کی فیرنی بھی بہت لذیذ اور شیریں لگی۔ فیرنی کی لذت سے آشنا ہوتے ہی انھیں ایک ایرانی کہاوت یاد آ گئی ''لب ریز ولب دوز لب سوز'' یعنی پیالی لبالب بھری ہو، گرم اتنی کہ ہونٹ جل جائیں اور میٹھی اتنی کہ ہونٹ چپک جائیں۔ کھانے کے بعد بنارسی پان کا بھی اہتمام تھا دوستوں کے اصرار پر پان کی لذت سے بھی آشنا ہوئے۔ انھوں نے ایسے قیمے اور کباب کا بھی ذکر کیا ہے جو خالص سبزیوں سے بنے ہوئے تھے۔ سفر نامہ نگار گوشت کم کھاتے ہیں۔ ایک جگہ دلچسپ انداز میں کہتے ہیں کہ:

''کبھی کبھار گوشت چکھ لیتا ہوں تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ کیسا مسلمان ہے گوشت نہیں کھاتا۔''

(ایضاً،ص:۸۸)

ان تمام تفصیلات سے ہندوستانی ثقافت بالخصوص لکھنوی طرز زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ایک پاکستانی کو یہاں کی تہذیب وثقافت سے کس قدر عقیدت اور محبت ہے۔ سید علی اکبر رضوی نے اپنے اس سفر نامے میں بعض تاریخی کوائف بھی بیان کیے ہیں۔ سفر نامے میں نواب واجد علی شاہ کا ذکر بھی موجود ہے۔ انگریزوں کی عیاری اور سازش کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ واجد علی شاہ کا ملکہ وکٹوریہ سے شکایت کرنے کی غرض سے انگلینڈ روانہ ہونا اور ان کی گرفتاری، وفات اور تدفین تک کا ذکر سفر نامے میں ملتا ہے۔

انھوں نے لکھنؤ کی علمی، ادبی اور مذہبی صورتحال اور وہاں کے قدیم ادبی ماحول پر بھی گفتگو کی ہے۔ وہاں کے تعلیمی اداروں خصوصاً ندوۃ العلماء اور لکھنؤ یونیورسٹی بھی زیر بحث ہیں۔ شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی تاریخی خدمات اور اس شعبہ سے وابستہ معروف ادباء، علماء اور اساتذہ کے نام بھی سفر نامے میں مذکور ہیں۔ لکھنؤ کا چار باغ ریلوے اسٹیشن انھیں خوب بھایا۔ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت اور وہاں کی منفرد خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''لکھنؤ چار باغ ریلوے اسٹیشن کی خوب صورتی سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ اور کیوں نہ ہو، نوابوں کا شہر رہا ہے۔ صبح بنارس اور شام اودھ سے کون واقف نہیں۔ لکھنؤ ایک نرالا اور منفرد شہر ہے۔ یہاں کی زبان وادب، تہذیب وثقافت، رفتار وگفتار، ملنے جلنے کا طریقہ، رہنے سہنے کا چلن سب سے جدا، سب سے نرالا اور سب سے پیارا ہے۔ ہر شخص جھک کر ملتا ہے، نرم گفتار ہوتا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب اودھ کی تہذیب کی جان ہے جس پر سارے ہندوستان کو ناز ہے۔''

(ایضاً،ص:۱۱۳)

لکھنؤ کی سیاحت کے بعد سفر نامہ نگار کا اگلا پڑاؤ بنارس تھا۔انھیں بذریعہ ٹرین بنارس جانا تھا۔دوران سفر پیش آنے والے واقعات کو بھی پر لطف طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔دوران سفر ریل گاڑی میں انھیں مجاز کی مشہور نظم ''رات اور ریل'' بہت یاد آئی۔سفر نامہ نگار نے اپنی تعلیمی زندگی کے دس برس اس شہر الفت میں گزارے تھے۔انھیں اس البیلے شہر سے گہری عقیدت تھی۔سفر نامے میں ان کی تمام تر حسرت ناک یادیں تازہ ہو گئی ہیں۔خاص طور پر سفر نامے کے اس حصے میں بنارس کے اہم تعلیم گاہوں اور علمی اداروں کے نام درج ہیں۔سچ پوچھیے تو بنارس کی تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، علمی اور ادبی صورت حال اور وہاں کی مشترکہ تہذیب و کلچر کی روح سفر نامے میں سمٹ آئی ہے۔سفر نامہ نگار نے یہاں کی گنگا جمنی تہذیب، گنگا گھاٹ، مندروں کی قطاریں، ریشمی ساڑیوں، بنارسی گلیوں وغیرہ کی اچھوتی تصویر کشی کی ہے۔انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے اپنے دیرینہ اور گہرے رشتے کو بھی بیان کیا ہے۔

سفر نامے میں مرزا غالبؔ کے سفر کلکتہ اور قیام بنارس کا ذکر بھی موجود ہے۔غالب کاشی کے شیدائی تھے۔انھیں یہ شہر بے حد پسند آیا۔غالبؔ نے اپنی فارسی مثنوی ''چراغ دیر'' میں بنارس کی خوب تعریف کی ہے۔اپنے اس سفر نامے میں انھوں نے گیان واپی مسجد اور وشو ناتھ مندر کا بھی خصوصی ذکر کیا ہے۔بنارس میں قیام کے دوران سید علی اکبر رضوی نے مشہور ایرانی شاعر شیخ علی حزیںؔ کے مزار کی زیارت بھی کی۔ان کا مزار کینٹ ریلوے اسٹیشن کے پاس واقع مشہور فاطمان قبرستان میں ہے۔انھوں نے خوبصورتی سے مزار کا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔

سفر نامہ نگار نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے کے امتیازات بھی بیان کیے ہیں۔کتب خانے میں موجود میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کے قلمی نسخے کا ذکر بھی سفر نامے میں ملتا ہے۔اس یونیورسٹی کے تعلق سے بعض تاریخی حقائق بھی درج ہیں۔یونیورسٹی کے کیمپس، اس کی عمارات اور رکھ رکھاؤ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔سفر نامہ نگار نے شعبۂ اردو، فارسی اور عربی کے چند تاریخی احوال بھی بیان کیے ہیں۔اخیر میں سفر نامہ نگار نے بنارس سے اپنی گہری عقیدت اور جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہم ایک رات مزید قیام کرنا چاہتے ہیں تاکہ اطمینان سے اپنا بنارس دیکھ سکیں، گنگا گھاٹ دیکھیں، مندروں کی قطاریں دیکھیں اور ممکن ہو تو صبح بنارس دیکھیں سب سے بڑھ کر مسلم اورینٹل اسکول، جے نارائن ہائی اسکول، بنارس ہندو یونیورسٹی دیکھیں جہاں ہم نے تعلیم حاصل کی اور علم کی روشنی دیکھی جس کی یادیں، بھولی بسری باتیں برابر یاد آتی ہیں۔''

(ایضاً،ص:۱۳۳)

بنارس کے قیام کے بعد وہ اپنے آبائی وطن اعظم گڑھ پہنچے۔ ان کا تعلق ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ سراائمہ سے رہا ہے۔ ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد ان کا پورا خاندان بکھر گیا تھا۔ کچھ لوگ کلکتہ اور کچھ دوسرے شہروں میں جا بسے۔ اس گاؤں میں ان کا اپنا اب کوئی نہ رہا تھا۔ ان کے پرانے دوست واحباب بھی اب اس دارفانی سے کوچ کر چکے تھے۔ گاؤں کے ہر مذہب وملت کے لوگوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اتنی لمبی مدت کے بعد اپنے گاؤں کے درودیوار کو دیکھتے ہی ان کے سینے میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ اب انھیں گاؤں کی ایک ایک باتیں یاد آنے لگیں۔ بھولی بسری یادیں ان کے دل ودماغ پر چھا گئیں۔

انھوں نے آبائی وطن سے اپنی جذباتی رشتے کو نہایت پرخلوص انداز میں بیان کیا ہے۔ سفرنامے میں گاؤں کی بے حد حسین اور خوبصورت جھلکیاں ملتی ہیں۔ کھیت، کھلیان، باغات اور مختلف قسم کی فصلوں، حیوانات ونباتات وغیرہ کے ذکر سے گاؤں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی مجسم ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اعظم گڑھ کے تعلیمی اداروں اور وہاں کی علمی وادبی فضا سے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے وہاں کی شبلی اکادمی کی زیارت بھی کی۔ انھیں وہاں کا کتب خانہ بے حد پسند آیا۔ سفرنامہ نگار نے شبلی اکادمی کی علمی وادبی خدمات پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے سرزمین اعظم گڑھ کے علمی وادبی ہستیوں کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ بعض معروف شخصیتوں کے نام واحوال بھی درج ہیں۔ اخیر میں سید علی اکبر رضوی اپنے جذبات کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پورے ایک ہفتہ گاؤں میں قیام رہا کیا بتاؤں کیا کیا دیکھا۔ کیا کیا سنا۔ کیسے کیسے لوگ ملے۔ کتنا احترام ملا اور کتنی محبتیں ملیں۔ اب جب کوئی پینتالیس سال بعد وہاں پہنچا تو ساری یادیں تازہ ہوگئیں اور نہ جانے کیوں میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔''

(ایضاً، ص:۱۷۲)

مذکورہ بالا تفصیلات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک پاکستانی شہری کو ملک ہندوستان سے کتنی گہری محبت اور عقیدت ہے۔ ایک ایک لفظ سے ان کے ذہنی وابستگی اور دلی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ مارچ کی پہلی تاریخ کو سفرنامہ نگار اعظم گڑھ سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ کلکتہ میں ایک ہفتہ قیام پذیر رہے۔ انھوں نے سب سے قبل اپنے خاندان کے لوگوں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا ذکر انھوں نے نہایت جذباتی اور عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرحدیں بٹ جانے کے بعد بھی انسانی رشتے اور انسانی دل کبھی الگ نہیں ہوتے۔ کلکتہ میں قیام کے دوران انھوں نے اس غریب پرور شہر اور

اس کی مشہور تاریخی عمارات کی خوب سیر کی۔ انھوں نے ان سب کا خوش اسلوبی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ سفرنامہ نگار نے نیشنل لائبریری، ناخدا مسجد، ٹیپو سلطان مسجد، گورنر ہاؤس، وکٹوریہ میموریل، ہاوڑہ پل وغیرہ جیسے تاریخی مقامات کا بغور مشاہدہ کیا۔ سفرنامے میں کلکتہ کی خصوصی تہذیب وثقافت اور وہاں کے طرز زندگی کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اس حصے میں انھوں نے کلکتہ کے بعض تاریخی حقائق اور پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ ایک جگہ ٹیپو سلطان کی شکست کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''چند ضمیر فروشوں کی غداری اور محلاتی سازشوں کی وجہ سے ٹیپو سلطان جنگ آزادی ہار گئے۔ میر جعفر اور میر صادق ضمیر فروشوں کی صف میں صاف نظر آتے ہیں۔''

(ایضاً، صفحہ:۱۱۸)

سید علی اکبر نے اس واقعہ کے تعلق سے علامہ اقبالؔ کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے ۔

جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن

سید علی اکبر کے سفر کا آخری پڑاؤ علی گڑھ تھا۔ وہ نو مارچ کو علی گڑھ پہنچے۔ سفرنامہ نگار نے یہاں کی تہذیب وثقافت نیز یہاں کے علمی، ادبی اور تاریخی حالات وکوائف کا گہرا مشاہدہ کیا۔ انھوں نے نہایت تفصیل سے سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کہ ہمہ گیر تحریک پر گفتگو کی ہے۔ سفرنامہ نگار کو سرسید احمد خاں کی اس تحریک اور ان کے افکار ونظریات سے والہانہ محبت ہے۔ سفرنامے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاریخی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ خاص طور پر انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، سرسید احمد خاں کا قیام بنارس اور سفر لندن وغیرہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔

سرسید احمد خاں کے بعض سوانحی کوائف ان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی اور سماجی خدمات بھی سفرنامے میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ سید علی اکبر نے سرسید احمد خان کے اہم رفقاء اور ان کی قربانیوں وخدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ سفرنامہ نگار کو علی گڑھ کی علمی اور ادبی فضا سے ایک روحانی لگاؤ ہے۔ انھوں نے وہاں کی مشہور لائبریری کی زیارت بھی کی۔ وہ مولانا آزاد لائبریری کے رکھ رکھاؤ سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس لائبریری کی انفرادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''یہ دنیا کی واحد لائبریری ہے جو چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہے۔ مولانا آزاد لائبریری کا شمار دنیا کی بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتب خانہ مخطوطات کے لحاظ سے بھی ہندوستان میں چوتھے نمبر پر مانا جاتا ہے۔ اس کتب خانے کا صدر دروازہ حد درجہ پرشکوہ ہے۔ دیکھتے ہی دل پر ایک

عظمت طاری ہو جاتی ہے۔ دروازہ پر قرآنی آیت 'علم الانسان مالم یعلم' لکھی ہوئی ہے۔''

(ایضاً، ص: ۲۲۴-۲۲۳)

سفر نامہ نگار نے علی گڑھ کے مشہور ٹیلر مہدی حسن کا بھی ذکر کیا ہے۔ مہدی حسن 'علی گڑھ شیروانی اور پائجامے' کے لیے ساری دنیا میں مشہور تھے۔ سید علی اکبر رضوی مہدی حسن کی شہرت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ٹیلر ماسٹر مہدی حسن صاحب ہندوستان کے معروف اور اعلیٰ ترین ماسٹر تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم ہستیوں کی شیروانیاں سیا کرتے تھے۔''

(ایضاً، ص: ۱۰۹)

علی گڑھ سید علی اکبر رضوی کے سفر کا آخری مرحلہ تھا۔ ۱۷/ مارچ کو وہ جیپ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ دہلی سے انھیں بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان واپس جانا تھا۔ ان کا یہ سفر نہایت خوشگوار اور یادگار رہا۔ اس سفر نامے میں انھوں نے اپنے گہرے تأثرات کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

یہ سفر نامہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور یہاں کی علمی و ادبی روایات کا ایک خوبصورت نگار خانہ ہے۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے سید علی اکبر رضوی نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت، گنگا جمنی تہذیب اور یہاں کی علمی، ادبی، سماجی، معاشرتی، جغرافیائی اور تاریخی وراثت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ڈھائی سو صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا ایک خوبصورت نگار خانہ ہے۔